قرآن اور ذوق مطالعہ

(سوالات و جوابات)

جوابات از

علمائے قم و نجف

مرتبہ

مجاہد حسین حرّ

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔

نام کتاب.................. قرآن اور ذوق مطالعہ (سوالات و جوابات)

جوابات از .... علمائے قم و نجف

مرتبہ .... مجاہد حسین حرؔ

پروف ریڈنگ .... خانم شازیہ غضنفر

کمپوزنگ .... قائم گرافکس۔ جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس فیز ۴

ناشر .... مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ ....

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ، غزنی سٹریٹ اردو بازار۔ لاہور

03214971214،04237361214

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد

03335234311

عرض ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کی ان صدقاتِ جاریہ میں سے ہے جس سے لوگ تا قیامت استفادہ کرتے رہیں گے اور موصوف کے درجات عالیہ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مصباح القرآن ٹرسٹ نے تراجم وتفاسیر قرآن سے کام شروع کیا اور پھر ہر وہ کتاب جس کی ملت کو ضرورت تھی شائع کی انشاء اللہ العزیز شائع کی جاتی رہے گی۔

موجودہ کتاب "قرآن اور ذوق مطالعہ" قرآنی معرفت کا ایک سلسلہ ہے۔ قرآن مجید سے شغف رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک مفید تحفہ ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب انشاء اللہ آپ کو پسند آئے گی۔

یاد رہے کہ مصباح القرآن نے اپنی تمام کتابیں آپ کے استفادہ کے لئے انٹرنیٹ پر دے دی ہیں۔ ایڈریس ہے:

www.misbahulqurantrust.com

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر وہ اس کتاب میں کہیں خامی دیکھیں یا کمی محسوس کریں تو ہمیں مطلع ضرور فرمائیں ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ ادارہ کے ترقی اور اس کے بانی محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کے طالب ہیں۔

ادارہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست کتاب

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ کی صرف ایک بیٹی تھی، اس آیہ شریفہ سے کیسے سازگار ہے کہ جس میں ارشاد ہوتا ہے اے پیغمبر! اپنی بیویوں اور بیٹیوں...... سے کہہ دو۔ 7

الف۔ خطاب میں قرآن مجید کی روش: 9

ب۔ روایات کی روشنی میں مسئلہ کی تحقیق: 12

بعض آیات میں اللہ نے اپنے لئے "ہم" اور بعض جگہ پر "میں" کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے؟ 16

قرآنی رو سے انسان ایک بڑا ظالم اور نادان وجود ہے یا خلیفۃ اللہ؟ 21

سورہ حجر کی آیت نمبر 90 میں مقتسمین سے خداوند متعال کی مراد کیا ہے؟ 25

بہت سی جگہوں پر قرآن مجید، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے کہ تم، لوگوں کے ایمان کے ذمہ دار نہیں ہو وغیرہ وغیرہ۔ کیا یہ امر بہ معروف اور جہاد ابتدائی کے منافی نہیں ہے؟ 29

کیا یہ بات درست نہیں ہے کہ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق اولیائے خدا کو نہ خوف ہوتا ہے نہ غم (یونس، ٦٢) پھر روز جمعہ کی دعا میں امام زمانہ علیہ السلام سے خطاب کر کے ہم یہ کیوں کہتے ہیں: السلام علیک ایھا المھذب الخائف یعنی سلام ہو آپ پر اے خوف زدہ رہنے والے پاک باطن؟ 33

انسان کس طرح خدا کا محبوب بندہ بن سکتا ہے؟ 39
خدا کے مجذوب اور محبوب ہونے کا امکان: 42
خدا کا محبوب ہونا 43
خدا کا محبوب ہونے کی راہیں: 43
۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی: 45
۲۔ واجبات، نوافل اور مستحبات کا بجا لانا: 45
محبوب عند اللہ: 47
مبغوض عند اللہ: 49
اگر بہشت کی لذتیں ملیں اور افسردگی ایجاد کرنے والی نہیں ہیں تو بہشتی کیسے ایک لذت کو چھوڑ کر دوسری لذت سے استفادہ کرتے ہیں؟ 54
کیونکہ خداوند متعال فیاض مطلق ہے، پس کیوں انسان پہلے سے ہی بہشت میں پیدا نہیں کئے گئے ہیں؟ 58
عبادت کے معنی: 59
کیا کلیسا میں جا کر وہاں پر نماز پڑھی جا سکتی ہے یا وہاں پر خداوند متعال سے راز و نیاز اور مناجات کی جا سکتی ہیں؟ 61
قرآن مجید میں بیان ہوئے سات آسمانوں کے کیا معنی ہیں؟ 63
پہلا نکتہ: آسمان و زمین کی تعداد: 64
دوسرا نکتہ: لغت میں سماء (آسمان) کا مقصد: 64
تیسرا نکتہ: قرآن مجید میں آسمان: 64
چوتھا نکتہ: سبع (سات) کا مراد کیا ہے؟ 65

پانچواں نکتہ: سات آسمان کے لفظ سے قرآن مجید کا مقصد 66
کیا فرشتوں میں عصمت کا کوئی درجہ پایا جاتا ہے؟ 69
حضرت سلیمانؑ اپنے بیٹے کی وفات کے بعد کیسے ملک و فرماں روائی کا تقاضا کرتے ہیں لیکن امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں: اے علیؑ! تیرے بعد اس دنیا پر حیف ہو!؟ 77
قرآن مجید کی آخری آیت کونسی ہے؟ کیا وحی میں اضافہ ہونے کا امکان تھا؟ 84
قرآن مجید اور تاریخ 88
قیامت کے بعد جب لوگ جنت یا جہنم میں جائیں گے تو کیا دوبارہ موت ہوگی؟ 92
نفس کے تجرد پر حکماء اور متکلمین کے بعض دلائل: 94

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ کی صرف ایک بیٹی تھی، اس آیہ شریفہ سے کیسے سازگار ہے کہ جس میں ارشاد ہوتا ہے اے پیغمبر! اپنی بیویوں اور بیٹیوں...... سے کہہ دو۔

ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے علاوہ کوئی بیٹی نہیں تھی۔ اب جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اکلوتی بیٹی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا تھیں تو، قرآن مجید کی اس آیت میں کیسے ارشاد ہوا ہے کہ: اے پیغمبر! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مومن عورتوں سے کہدو کہ اپنے دوپٹوں کو اپنے اوپر اوڑھ لو۔۔۔ اس آیت میں لفظ بنات بیٹیاں استعمال ہوا ہے! کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ پیغمبر کی ایک سے زیادہ بیٹیاں تھیں؟

مختصر جواب

کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے علاوہ کوئی بیٹی تھی یا نہیں، یہ ایک تاریخی بحث ہے۔ واضح ہے کہ تاریخی بحث کا اپنا ایک طریقہ کار ہوتا ہے، اس لئے اس مسئلہ کو ثابت یا نفی کرنے میں بظاہر ایک آیت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے، خاص کر جب سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید کی بہت آیات میں خطاب کے دوران جمع کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن اس سے مفرد کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ محققین نے قرآن

مجید کی شان نزول کے سلسلہ میں بہت ساری آیات جن میں مفرد کی جگہ پر لفظ جمع استعمال کیا گیا ہے کی شان نزول میں اس مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے، مثال کے طور پر اس آیہ شریفہ میں: جو لوگ یتیموں کے مال کو ظلم وستم سے کھاتے ہیں (حقیقت میں) وہ صرف آگ کھاتے ہیں اور وہ جلدی ہی (جہنم کی) آگ کے شعلوں میں جل جائیں گے۔ آیہ شریفہ کے الفاظ (الذین یاکلون وھم) جمع استعمال ہوئے ہیں، جبکہ یہ آیت صرف ایک شخص (مرثد بن زید غطفانی) کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ اسی طرح آیہ شریفہ: جنہوں نے ظلم وستم برداشت کرنے کے بعد راہ خدا میں ہجرت کی، ہم ان کو اس دنیا میں اچھا مقام عطا کریں گے اور آخرت کی پاداش اس سے بھی بڑی ہے اگر وہ جانتے۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت ابی جندل بن سہیل کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ اس قسم کی واضح ترین آیات میں آیہ مباہلہ ہے کہ خداوند متعال قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: ہم بھی اپنی عورتوں کو دعوت دیں گے اور تم بھی اپنی عورتوں کو دعوت دو۔ واضح ہے کہ ہماری عورتوں سے مراد حضرت فاطمہ زہراؑ ہے۔ وہ مباہلہ کے مسئلہ میں [پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے] تنہا عورت تھیں اور تمام مفسرین اس مسئلہ پر اتفاق نظر رکھتے ہیں۔ اس لئے قرآن مجید کے خطاب اور روش کے مطابق اس مسئلہ میں ثبات یا نفی ممکن نہیں ہے۔

محققین اور مورخین کے درمیان پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹیوں کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض افراد نے اس کو ثابت کرنے کے لئے کئی روایتوں سے استناد کیا ہے نہ صرف بظاہر قرآن مجید سے۔ اس مقابلے میں ایک دوسرے شخص (سید عاملی) نے اس مسئلہ کے بارے میں آیات میں ٹکراؤ اور ناسازگاری سے استناد کر کے اس بارے میں ایک کتاب تالیف کی ہے اور اس کا نام بنات النبی ام ربائبہ (پیغمبر کی بیٹیاں یا ان کی ربائب[i]) ہے۔

[i]. قرآن مجید نے سورہ نساء کی آیت نمبر ۲۳ میں ربائب کی طرف اشارہ کیا ہے:
تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری آغوش میں پلی ہیں۔

تفصیلی جواب

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ایک اہم مسئلہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ تحقیق کے سلسلہ میں ہر علم کا ایک خاص طریقہ کار ہوتا ہے۔ واضح ہے کہ ہمارے سوال کا موضوع تاریخ اور سیرت سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے اس علم کے طریقہ کار پر بحث ہونی چاہئے جس کا دارومدار تاریخی نقل پر ہے اس کے علاوہ خطاب کے سلسلہ میں قرآن مجید کی روش کے بارے میں پہچان حاصل کی جانی چاہئے۔

اس بنا پر ہم اس مسئلہ پر دو ابعاد میں بحث کریں گے: خطاب میں قرآن مجید کی روش اور روایتوں کی روشنی میں مسئلہ کی تحقیق۔

الف۔ خطاب میں قرآن مجید کی روش:

جو لوگ قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ بہت سے مواقع پر مفرد کے لئے جمع کا لفظ استعمال ہوا ہے اور یہ تعظیم کے عنوان سے استعمال ہوتا ہے اس سلسلہ میں قرآن مجید میں کافی شواہد موجود ہیں اور ان آیات کی شان نزول کے بارے میں نقل کی گئی روایتیں بھی اس کی تاکید کرتی ہیں۔ من جملہ مندرجہ ذیل آیات:

ا۔ ہم ہی نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں [1]۔

۲۔ اور ہم چاہتے تو جبراً ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے [2]۔

۳۔ بیشک ہم زمین اور جو کچھ زمین پر ہے سب کے وارث ہیں [3]۔

شیخ طوسی اس سلسلہ میں کہتے ہیں: اس قسم کا استعمال ایسے مواقع پر ہوتا ہے جہاں پر شخص بڑے مقام و منزلت کا مالک ہو[4]۔

اس قسم کی دوسری آیات، جن کی شان نزول خاص افراد کے بارے میں ہے لیکن ان میں صیغہ جمع استعمال ہوا ہے، من جملہ:

۱۔ جو لوگ ظالمانہ انداز سے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ درحقیقت اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں[5]۔

مقاتل کہتا ہے کہ یہ آیت مرثد بن زید غطفانی کی شان میں نازل ہوئی ہے[6]۔

۲۔ خدا تمہیں ان لوگوں کے بارے میں، جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں وطن سے نہیں نکالا ہے اس بات سے نہیں روکتا ہے کہ تم ان کے ساتھ نیکی اور انصاف کرو[7]۔

اہل سنت محدثین نے کہا ہے کہ یہ آیت ابوبکر کی بیٹی اسماء کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ جب ان کی والدہ قتیلہ بنت عبدالعزی جو مشرک تھی، تحفے تحائف لے کر آ گئی تو اسماء نے کہا: میں تیرے تحفے قبول نہیں کرتی ہوں، میرے گھر میں داخل نہ ہونا جب تک میں رسول خدا ص سے اجازت لے لوں۔

انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا تو یہ آیت نازل ہوئی[8]۔

۳۔ یہ جاہل مشرکین کہتے ہیں کہ خدا ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا اور ہم پر کوئی آیت کیوں نازل نہیں کرتا[9]۔

یہ آیت رافع بن حرملیہ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ محمد بن اسحاق، ابن عباس سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں: رافع نے پیغمبر اکرم ص سے عرض کی، اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ رسول خدا ہیں، پس خدا سے کہہ دینا کہ ہمارے ساتھ گفتگو کرے

تا کہ ہم اس کی بات کو سن لیں اور خداوند متعال نے اس آیہ شریفہ کو نازل فرمایا[10]۔
۴۔ یقیماً جو لوگ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں اور انہوں نے نماز قائم کی ہے[11]۔
کہا گیا ہے کہ یہ آیت حصین بن حارث بن عبدالمطلب کی شان میں نازل ہوئی ہے[12]۔
۵۔ اور جن لوگوں نے ظلم سہنے کے بعد راہ خدا میں ہجرت اختیار کی ہے ہم عنقریب دنیا میں بھی ان کو بہترین مقام عطا کریں گے اور آخرت کا اجر تو یقیناً بہت بڑا ہے[13]۔
یہ آیت ابی جندل بن سہیل کی شان میں نازل ہوئی ہے[14]۔
٦۔ یہ وہ ایمان لانے والے ہیں جن سے بعض لوگوں نے کہا لوگوں نے تمہارے لئے عظیم لشکر جمع کرلیا ہے[15]۔
اس آیت میں ناس کی تعبیر سے جس شخص کے بارے میں صیغہ جمع استعمال ہوا ہے وہ نعیم بن مسعود اشجعی ہے[16]۔
۷۔ یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ راہ خدا میں کیا خرچ کریں[17]۔
یہ آیت عمرو بن جموع کی شان میں نازل ہوئی ہے[18]۔
۸۔ اور دوسرے وہ لوگ جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا[19]۔
یہ آیت ابی لبابہ انصاری کی شان میں نازل ہوئی ہے[20]۔
۹۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ واپس اگئے تو ہم صاحبان عزت ان زلیل افراد کو نکال باہر کریں گے[21]۔
یہ بات کہنے والا ایک ہی شخص، یعنی عبداللہ بن ابی ہے[22]۔
اس سلسلہ میں آیات کے ایسے نمونے کافی پائے جاتے ہیں اور ہم آیہ مباہلہ کی

طرف اشارہ کر کے اس موضوع کو ختم کرتے ہیں [23]۔

۱۰۔ ان سے کہہ دیجئے کہ آؤ ہم لوگ اپنے اپنے فرزند، اپنی اپنی عورتیں۔۔۔ بلائیں [24]۔

شیعہ اور سنی کے ہاں یہ مسلمات میں سے ہے کہ نسائنا سے مراد صرف حضرت زہرا سلام اللہ علیہا ہے [25]۔

بیان شدہ مطالب کے پیش نظر خدا کے کلام میں عبارت بنا تک سے استناد نہیں کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک سے زیادہ بیٹیاں تھیں، کیونکہ قرآن مجید کی روش اس سلسلہ میں ہماری مدد نہیں کرتی ہے۔ پس ممکن ہے اس سے مراد حضرت زہراؑ ہو اور تعظیم کے لئے صیغہ جمع لایا گیا ہو، جیسا کہ آیہ مباہلہ میں آیا ہے۔

ب۔ روایات کی روشنی میں مسئلہ کی تحقیق:

محققین کے درمیان اس مسئلہ پر اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں انکار کرنے والوں میں علامہ جعفر مرتضیٰ عاملی قابل ذکر ہیں کہ انہوں نے اپنی کتاب الصحیح من السیرۃ میں اس بحث کو چھیڑا ہے اور اس کے علاوہ اس موضوع پر ایک مستقیل کتاب تالیف کی ہے، جس کا نام بنات النبی ام ربائبہ ہے۔ آپ اس کتاب کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ وہ اس کتاب میں اس مسئلہ پر تمام زاویوں سے بحث و تحقیق کے بعد یوں نتیجہ نکالتے ہیں:

مذکورہ مطالب سے واضح ہوا کہ رقیہ نامی جس لڑکی سے عثمان نے ازدواج کیا تھا، وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی نہیں تھی۔ وہ کہتے ہیں: اگر ہم تاریخی روایات پر زیادہ سے زیادہ وقت اور سنجیدگی سے فیصلہ کرنا چاہیں، تو فرض کی بنا پر حضرت خدیجہ سے پیغمبر اکرمؐ کی متعدد بیٹیوں کو قبول کرنے کی صورت میں قبول کرنا چاہئے کہ وہ بچپن میں ہی اس دنیا سے رخصت ہوگئی ہیں

اور کسی سے ان کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ ہم جو دیکھتے ہیں کہ عثمان نے رقیہ نامی ایک لڑکی اور اس کے بعد ام کلثوم نامی ایک لڑکی سے شادی کی ہے، وہ دونوں اگرچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹیوں سے نام میں شباہت رکھتی تھیں، لیکن وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹیاں نہیں تھیں۔ شاید عثمان کی دو بیویوں کے نام پیغمبرؐ کی بعثت کے بعد پیدا ہوئی اور بچپن میں فوت ہوئی دو بیٹیوں سے شباہت کی وجہ سے بعض لوگ مغالطہ سے دوچار ہوئے ہیں اور دعویٰ کیا ہے کہ عثمان کی یہ دو بیویاں وہی رقیہ وام کلثوم ہیں، جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹیاں ہیں۔ اس کے علاوہ شاید عثمان کی مزکورہ دو بیویاں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ربائب تھیں، اس لئے اس شبہ کو تقویت بخشنے کا سبب بنی ہیں، کیونکہ عربوں میں یہ رسوم ہے کہ وہ کسی کی ربیبہ کو اس کی بیٹی شمار کرتے ہیں[26]۔

ہم سید عاملی کے کلام کی تائید یا اسے مسترد کرنا نہیں چاہتے ہیں، کیونکہ سید عاملی سے پہلے بعض محققین نے عثمان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے داماد ہونے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک سے زیادہ بیٹیاں ہونے کو قبول کیا ہے۔ لیکن ہم نے اپنی بحث کو اس نقطہ پر متمرکز کیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک سے زیادہ بیٹیاں ہونے کا صرف قرآن مجید میں اشارہ شدہ آیات سے ہی استناد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہاں پر مناسب ہے کہ ہم اس اہم نقطہ کی طرف اشارہ کریں اور وہ یہ ہے کہ جب ہم شان نزول بیان کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ فلاں آیت فلاں مرد یا فلاں عورت کے بارے میں نازل ہوئی ہے، تو ہماری مراد یہ نہیں تھی کہ ہم ان سب کی تائید کرتے ہیں، بلکہ اس میں ہمارا مقصد ان مسائل میں قرآن مجید کی روش کو جاننا تھا کہ قرآن مجید نے بعض مواقع پر مفرد کے لئے صیغہ جمع کا استعمال کیا ہے اور یہ ایک ایسی صحیح اور مستحکم روش ہے جس کا اہل سنت محققین نے اعتراف کیا ہے۔ پس اگر کوئی شخص کسی کے پیغمبر اکرمؐ کے داماد ہونے کو ثابت کرنا چاہے تاکہ اس طرح اس داماد کے لئے کسی فضیلت کو ثابت کرے، تو وہ صرف اس آیت سے استفادہ نہیں کر سکتا ہے، بلکہ اس کو اسے ثابت

کرنے کے لئے کوئی اور مستند طریقہ اپنانا چاہیئے اور وہ یہی اس سلسلہ میں روایات کی تحقیق کرنا ہے۔

حواشی

[1] حجر،9.

[2] سجدہ،13.

[3] مریم،40.

[4] شیخ طوسی، الرسائل العشر (درس رسالے)،ص133.

[5] نسا،10.

[6] تفسیر القرطبی، ج1،ص36؛ الاصابہ، ج3،ص397.

[7] ممتحنہ،8.

[8] صحیح بخاری، 2-924، حدیث 2477؛ صحیح مسلم، 2- 391، حدیث 50؛ مسند احمد،7- 483، حدیث 26375، الجامع لأحکام القرآن، 18-40.

[9] بقرہ118.

[10] تفسیر ابن کثیر، ج1،ص161.

[11] فاطر29.

[12] الاصابہ،1-336.

[13] نحل41.

[14] ابن عساکر، تاریخ مدینہ دمشق، 8-668.

[15] آل عمران173.

[16] الجامع لأحکام القرآن، 4-178؛ تفسیر ابن کثیر، 1-430؛ تفسیر الخازن، 1-360.

[17] بقرہ215و219.

[18] الجامع لأحکام القرآن، 3-26.

[19] توبہ102.

[20] الجامع لأ حکام القرآن، 8-154.

[21] منافقون 8.

[22] مسند احمد بن حنبل، 3-392.

[23] ہم نے اس آیت کو اس لئے آخر پر بیان کیا تا کہ بحث کا سیاق ہمارے مطلوبہ نتیجہ سے مرتب ہو جائے۔

[24] آل عمران 61.

[25] صحیح مسلم، 15-176و....

[26]بنات النبی أم ربائبہ، تحت عنوانا للمسات الأخیرہ

بعض آیات میں اللہ نے اپنے لئے "ہم" اور بعض جگہ پر "میں" کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے؟

مختصر جواب

اگرچہ اللہ ایک ہے اور قاعدۃً اپنے بارے میں خبر دینے کے لئے ضمیر واحد استعمال ہونا چاہئے اور اسی وجہ سے قرآن میں متعدد مقامات پر اسی طرح کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ لیکن عربی زبان میں اور کبھی غیر عربی میں بھی متکلم کچھ اسباب کے تحت اپنے لئے ضمیر واحد کے بجائے ضمیر جمع کا استعمال کرتا ہے۔ ان اسباب میں سے بعض اس طرح ہیں:

۱۔ اپنی عظمت سے مخاطب کو آگاہ کرنے کے لئے

۲۔ انجام شدہ کام کی عظمت کو بتانے کے لئے

۳۔ ان اسباب و علل کی طرف توجہ دینے کی خاطر جو کام کے انجام کے لئے قرار دیئے گئے ہیں

تفصیلی جواب

آپ کے سوال کا جواب دینے کے لئے دو مقدمہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

پہلا مقدمہ:

علم عقائد (کلام اسلامی) کے علماء نے اللہ کے ایک ہونے پر متعدد عقلی دلائل قائم

کئے ہیں اور اللہ کے ایک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ صرف وہ ہے جو مستقل طور پر کسی کے سہارے کے بغیر خلق کرتا ہے، روزی دیتا ہے، ہدایت کرتا ہے اور مارتا ہے نیز......۔ اور علم کلام میں ان کو خالقیت کی توحید، رزاقیت کی توحید اور ہدایت کی توحید نیز......کہا جاتا ہے۔

دوسرا مقدمہ

مندرجات بالا کا یہ مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی بھی چیز خالقیت، رزاقیت اور ہدایت میں کسی طرح بھی سببیت نہیں رکھتی ہے، بلکہ اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ خلق کرنے، رزق دینے اور ہدایت کرنے بلکہ اپنے اکثر اعمال کو اسباب وعلل کے راستے سے انجام دے۔[1]

مثلاً اگرچہ اللہ بغیر کسی واسطہ کے براہ راست بیماروں کو شفا دے سکتا ہے یا بھوکے کو سیر کرسکتا ہے یا پھر گمراہوں کو ہدایت دے سکتا ہے لیکن اپنی حکمت کی بنیاد پر اس نے یہ پسند کیا ہے کہ ہر کام کے لئے خاص اسباب وعلل قرار دے اور ہر کام کو انہی کے ذریعہ انجام دے۔ لہٰذا بھوکے کو اس روٹی کے ذریعہ سیر کرتا ہے جو خود اسی نے پیدا کی ہے، مریض کو اپنی خلق کردہ دوا اور اپنے پروردہ ڈاکٹر کے ذریعہ شفا دیتا ہے، البتہ روٹی، دوا اور ڈاکٹر بلکہ تمام اسباب اسی کے اذن سے تاثیر پاتے ہیں اور اپنا خاص نتیجہ رکھتے ہیں اور جب دوا، ڈاکٹر، روٹی اور پانی وغیرہ سب کے سب اپنے وجود کو دائما اسی سے لیتے ہیں اور اس کے اذن سے یہ اثرات رکھتے ہیں تو یہ سب کسی طرح بھی اللہ کی توحید اور اس کے مختلف زاویوں سے منافات نہیں رکھتے اور اللہ کے شریک نہیں ہیں، بلکہ یہ سب مخلوقات ہیں اور اپنی ہر چیز منجملہ تاثیر میں اللہ کی محتاج ہیں۔

اب گذشتہ باتوں کے پیش نظر اصل جواب کی طرف آتے ہیں:

اگر اللہ ایک ہے اور قاعدۃً اپنے افعال کے بارے میں خبر دینے کے لئے ضمیر واحد کا استعمال کرنا چاہئے[2] اسی سبب قرآن میں بارہا اسی طرح سے کلام کیا گیا ہے۔[3] لیکن

عربی زبان میں اور کبھی غیر عربی زبان میں مختلف وجوہات کی بنیاد پر متکلم بعض جگھوں پر [میں] کہنے کے بجائے [ہم] کا استعمال کرتا ہے۔

ذیل میں ایسی بعض وجوہات کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے:

ا۔قرآن کریم نے عام محاورہ کی زبان کو اختیار کیا ہے جو لوگوں سے رابطہ کا بہترین ذریعہ ہے۔اور عام لوگ اپنے محاورے میں کبھی کہتے ہیں کہ فلاں بستی میں اتنے آدمی رہتے ہیں جبکہ یقینا بستی میں خواتین بھی ہوتی ہیں، اسی طرح قرآن میں ہے کہ [اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ] اس میں ضمیر [انتم] مذکر کی ضمیر ہے جبکہ خطاب عام ہے اور عورت مرد دونوں کو شامل ہوتا ہے اور ہر عاقل سمجھتا ہے کہ تمام انسان مقصود ہیں نہ کہ صرف مرد۔ضمیر واحد و جمع میں بھی ملتا ہے کہ لوگ بہت سی جگھوں پر ضمیر واحد کے بجائے جمع کی ضمیر استعمال کرتے ہیں ؛ مثلا کہتے ہیں کہ [ہم آئے لیکن آپ نہیں تھے][4] اس میں [ہم] اور [آپ] دونوں لفظیں بنیادی طور پر جمع کے لئے ہیں جبکہ متکلم کا مقصود واحد ہے؛ لیکن احترام، تعظیم اور کسی کو اہمیت دینے کے لئے جمع کا استعمال کیا جاتا ہے۔اللہ کے سلسلہ میں بھی تعظیم و احترام و اکرام کے لئے ضمیر [نحن] کا استعمال کیا گیا ہے۔[5]

بہر حال متکلم اپنی عظمت مخاطب کو بتانے کے لئے [میں] کے بجائے [ہم] کا استعمال کرتا ہے جو متکلم کی عظمت و بزرگی پر دلالت کرتا ہے۔

قرآن کی ایک مثال: سورہ فتح کی ابتدا میں فرماتا ہے: انا فتحنا لک فتحا مبینا۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں اللہ نے اپنی عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ہم نے شہر مکہ کو فتح کیا: لیکن یہاں اللہ نے [ہم] کیوں کہا، ظاہر ہے کہ یہ اس لئے کہا کیونکہ عظمت کی طرف اشارہ کرنے والی ضمیر [ہم] فتح کے ذکر سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔یہی بات آیہ [اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا ......] میں بھی آئے گی۔[6]

۲۔ کبھی متکلم اپنے ذریعہ انجام پانے والے کام کی عظمت کو بیان کرنے کے لئے [میں نے یہ کام کیا] کے بجائے [ہم نے یہ کام کیا] کہتا ہے جیسے:

إِنَّآ أَنزَلۡنَٰهُ فِي لَيۡلَةِ ٱلۡقَدۡرِ ۝١] یا [إِنَّآ أَعۡطَيۡنَٰكَ ٱلۡكَوۡثَرَ ۝١

جس میں قرآن اور کوثر کی عظمت مدنظر ہے۔

۳۔ کبھی اللہ ہم کو ان اسباب کی طرف متوجہ کرنے کے لئے [ہم] کا استعمال کرتا ہے جنہیں اس نے کوئی کام انجام دینے کے لئے قرار دیا ہے۔ لہٰذا [میں] کے بجائے [ہم] کا استعمال کرتا ہے۔ اسی وجہ سے سورہ رعد کی چوتھی آیت کے ذیل میں تفسیر المیزان کے اندر یوں لکھا ہے:

یہی [ہم نے بعض کو بعض پر برتری دی] میں [ہم] کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ سے خالی نہیں ہے کہ اللہ کے علاوہ بھی کچھ الٰہی اسباب پائے جاتے ہیں جو اسی کے امر پر عمل کرتے ہیں اور سب کے سب اللہ ہی تک جا کر ختم ہوتے ہیں۔[7]

اللہ کی ذات کے ہر جہت سے یکتا ہونے کے باوجود اس کے سلسلہ میں صیغہ جمع کا استعمال اس کی عظمت کی طرف اشارہ ہے اور یہ کہ ہمہ وقت کچھ مامورین اس کے منتظر و تابع فرمان رہتے ہیں اور اس کی اطاعت امر کے لئے تیار رہتے ہیں، اور درحقیقت صرف اسی کی بات نہیں ہے بلکہ اس کے بارے میں ہے اور تمام مامورین اسکے مطیع ہیں۔

یاددھانی

ممکن ہے کسی آیت میں تینوں حکمتیں جمع ہوں ؛ یعنی جمع کی ضمیر استعمال کی گئی ہو تا کہ فاعل کی عظمت بھی بیان ہو، فعل کی عظمت بھی اور اسباب کی طرف توجہ بھی مقصود ہو۔ جیسے: إِنَّآ أَنزَلۡنَٰهُ فِي لَيۡلَةِ ٱلۡقَدۡرِ ۝١ یہاں تینوں حکمتیں صادق آتی ہیں۔

حواشی:

[1] [ابی اللہ ان یجری الامور الا بالاسباب] کافی، ج۱، ص۱۸۳، باب معرفۃ الامام والرد علیہ......۔

[2] یہاں یہ سوال درست نہیں ہے کہ اللہ نے بعض جگہوں پر ضمیر واحد کا استعمال کیوں کیا ہے، صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اللہ نے ہمیشہ ضمیر واحد کو کیوں استعمال نہیں کیا ہے؟ اور اس کا جواب آگے آرہا ہے۔

[3] جیسے: [ادْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ط ......] غافر۔۶۰ اور......

[4] لکھنؤ میں آج بھی عام طور پر [میں] کے بجائے [ہم] کا استعمال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ لڑائی جھگڑے میں بھی یہی انداز برقرار رہتا ہے۔ (مترجم)

[5] مزید معلومات کے لئے: ناصر مکارم، پرسش و پاسخ، ج۳، ص۲۵۶

[6] ترجمہ (فارسی) المیزان ج۱۸، ۳۸۵

[7] ایضا، ج۱۱، ص۴۰۱

قرآنی رو سے انسان ایک بڑا ظالم اور نادان وجود ہے یا خلیفۃ اللہ؟

مختصر جواب

۱۔قرآن نے ایک طرف متعدد جگہوں پر انسان کے بلند و بالا رتبہ کا اعلان کیا ہے لیکن دوسری طرف بہت سی آیتوں میں اس کی مذمت اور سرزنش بھی کی ہے۔

۲۔ انسان کی حرکت، بے انتہا بلندی و پستی کی سمت ہوتی ہے اور اس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔اور یہ انسان کی غیر معمولی صلاحیت کے سبب ہے۔

۳۔انسان دو پہلومخلوق ہے؛ ایک روحانی وملکوتی اور دوسری حیوانی ونفسانی۔

۴۔انسان دوسرے موجودات کے برخلاف ارادہ واختیار سے بہرہ مند ہے اور خود ہموار کی ہوئی زمین پر اپنے اختیار کے ساتھ زندگی کا راستہ انتخاب کرتا ہے۔

۵۔ وہ لوگ خلیفۃ الٰہی کے منصب تک پہنچتے ہیں جو الٰہی ہدایت کو اپنائیں اور سرکش آرزؤں اور حیوانی صفات کو کنٹرول کریں۔

تفصیلی جواب

قرآن کریم کا سرسری مطالعہ کرکے ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ انسان کے بارے میں دو طرح کی آیات ملتی ہیں: پہلے دستہ میں وہ آیتیں ہیں جو انسان کی عظمت بیان

کرتی ہیں اور اس کی شان کو بیان کرتی ہیں۔ مثلاً یہ آیتیں:

۱۔ اور ہم نے بنی آدم کو کرامت عطا کی ہے اور انہیں خشکی اور دریاؤں میں سواریوں پر اٹھایا ہے، انہیں پاکیزہ رزق عطا کیا ہے اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سوں پر فضیلت دی ہے۔[1]

۲۔ اے رسول. اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں اور انہوں نے کہا کہ کیا اسے بنائے گا جو زمین میں فساد برپا کرے اور خونریزی کرے جب کہ ہم تیری تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں تو ارشاد ہوا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے[2]۔

۳۔ بیشک ہم نے امانت کو آسمانً زمین اور پہاڑ سب کے سامنے پیش کیا اور سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور خوف ظاہر کیا پس انسان نے اس بوجھ کو اٹھالیا کہ انسان اپنے حق میں ظالم اور نادان ہے۔[3]

دوسرے دستہ میں وہ آیتیں ہیں جن میں انسان کی مذمت کی گئی ہے اور سخت لفظوں میں اس کی سرزنش کی گئی ہے مثلا: وہ بالکل مایوس اور بے آس ہوجاتا ہے[4]،انسان سرکشی کرتا ہے[5]، بیشک انسان بڑا ظالم اور انکار کرنے والا ہے[6]،انسان اپنے حق میں ظالم اور نادان ہے[7]، ہمارا کھلا ہوا دشمن ہوگیا ہے[8]، بے شک انسان خسارہ میں ہے[9] وغیرہ۔

اب ان آیات کو ملاحظہ کرنے کے بعد یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر بات کیا ہے؟ ظاہری اعتبار سے ان متضاد آیتوں کی مراد کیا ہے؟

اس سوال کے جواب کے لئے بہتر ہے کہ خود قرآن سے مدد لیں؛ چونکہ اس آسمانی کتاب کی بعض آیتیں بعض دوسری آیتوں کی تفسیر کرتی ہیں۔

سورہ بیّنۃ میں ہم پڑھتے ہیں:

بے شک اہل کتاب میں جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے اور دیگر مشرکین سب جہنمّ میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور یہی بدترین خلائق ہیں اور بے شک جو لوگ ایمان لائے ہیں اورانہوں نے نیک اعمال کاانجام دیئے ہیں وہ بہترین خلائق ہیں[10]۔

ایک سورے کی ان دو ملی ہوئی آیتوں میں انسان کو بہترین اور بدترین دونوں کا عنوان دیا گیا ہے اور یہ اس کی بلندی اور پستی کی بےانتہائی کو بتاتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایمان اور عمل صالح والا ہوگا تو اللہ کی بہترین مخلوق ہوگا اور اگر کفر و گمراہی اور الحاد و انکار کی راہ کو اپنائے گا تو اس طرح سقوط کرے گا کہ اللہ کی بدترین مخلوق ہوجائے گا۔

حضرت علی علیہ السلام ایک روایت میں فرماتے ہیں: اللہ نے کائنات کی خلقت کو تین طرح کا پیدا کیا: فرشتے، حیوان اور انسان؛ فرشتوں کے پاس عقل ہے لیکن شہوت وغضب نہیں ہے، حیوانات میں شہوت وغضب ہے لیکن عقل نہیں ہے، لیکن انسان کے پاس شہوت و غضب بھی ہے اور عقل بھی ان میں سے اگر عقل غالب آ گئی تو وہ فرشتوں سے بھی برتر ہے اور اگر شہوت وغضب غالب آ گئے تو حیوانوں سے بھی پست تر ہے[11]۔

اس نورانی روایت سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جس طرح انسان دوبعدی (روحانی و نفسانی) مخلوق ہے اسی طرح اس کے رجحانات اور خواہشات بھی دو طرح کے ہیں (روحانی رجحانات اور نفسانی رجحانات) اور وہ اللہ کی طرف سے عطا کئے گئے ارادہ و اختیار کی بنیاد پر ان میں سے کسی کا بھی انتخاب کرکے انسانی معراج پر پہنچ سکتا ہے یا پھر اتنا پست بھی ہوسکتا ہے کہ قرآن کے بقول حیوان سے بھی گر جائے۔[12]

لہٰذا قرآن کی آیتیں اس حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہیں کہ تمام انسان صلاحیت و استعداد کے مرحلے تک اس کی اہلیت رکھتے ہیں کہ بہترین محترم ترین بلکہ فرشتوں سے بھی

زیادہ برتر ہوجائیں اور وہ ان بالقوۃ صلاحیتوں کو فعال کر کے خلیفۃ اللہ کے درجہ تک پہنچ سکتے ہیں ؛ لیکن اگر اللہ کی عطا کردہ اس استعداد سے استفادہ نہ کریں تو الٰہی مذمت کے اہل قرار پائیں گے جس کا مختصر تذکرہ ہم نے کیا ہے۔

مزید معلومات کے لئے رجوع کریں:

المیزان (ترجمہ فارسی)، ج16، ص524-527؛

تفسیر نمونہ، ج8، ص242، ج17، ص451، 457

حواشی

[1] اسرا-70

[2] بقرہ-30

[3] احزاب-72

[4] فصلت 49-50-51

[5] علق-6

[6] ابراہیمؑ-34

[7] احزاب-72

[8] یس-77

[9] عصر-2

[10] بیّنہ 6-7

[11] تفسیر نورالثقلین، ج3، ص188

[12] أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ، اعراف-179

سورہ حجر کی آیت نمبر 90 میں مقتسمین سے خداوند متعال کی مراد کیا ہے؟

مختصر جواب

آیہ شریفہ میں جو لفظ المقتسمین ہے، وہ تقسیم اور تجزیہ کرنے والوں کے معنی میں آیا ہے لیکن یہ کہ اس آیہ شریفہ کی شان نزول کیا ہے اور کن کے حق میں نازل ہوئی ہے، اس سلسلہ میں تفسیروں میں چند احتمال بیان ہوئے ہیں:

1. کفار کے سردار، ایام حج میں سڑکوں اور مکہ میں داخل ہونے کی جگہوں پر بعض افراد کو تقسیم کر کے رکھتے تھے، تا کہ مسافروں کو کہہ دیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نامی ایک شخص نے کچھ دعویٰ کیا ہے، ایسا نہ ہو کہ اس کی بات کی طرف توجہ کریں اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کاہن، ساحر اور دیوانہ معرفی کرتے تھے

2. وہ گروہ جو آپس میں قرآن کو تقسیم کرتے تھے، تا کہ ان میں سے ہر ایک قرآن مجید کے مشابہ لے آئے

3. وہ لوگ جو قرآن مجید کے ایک حصہ پر عمل کرتے تھے اور ایک حصہ کو چھوڑ دیتے تھے

4. قریش کا ایک قبیلہ تھا، جنہوں نے قرآن مجید کو پارہ کیا، کچھ لوگوں نے کہا سحر

ہے، کچھ لوگوں نے کہا کہ پرانے لوگوں کا افسانہ ہے اور ایک جماعت نے کہا کہ جعلی ہے

5. بعض لوگوں نے کہا: یہودی اور عیسائی اسلام سے پہلے ہیں اور دین میں تفرقہ اور اختلاف سے دوچار ہوئے اور مختلف فرقوں میں بٹ گئے، ہر فرقہ اپنی جگہ پر شاد تھا اور قرآن مجید کا مراد، آسمانی کتاب ہے

اس لئے واضح ہوگیا کہ سورہ حجر کی آیت نمبر 90 سے خداوند متعال کی مراد قرآن مجید کے جعلی نسخہ کا وجود یا شائع ہونا نہیں ہے

تفصیلی جواب

خداوند متعال نے سورہ حجر کی آیت نمبر 89 سے 90 تک دستور دیتے ہوئے فرمایا ہے: بے ایمان افراد کے سامنے ڈٹ کر رہنا اور صراحت سے کہدو کہ میں تو بہت واضح انداز سے ڈرانے والا ہوں [1] کہدو کہ میں تمہیں خطرہ کا اعلان کرتا ہوں، کیونکہ خداوند متعال نے فرمایا ہے میں تم پر ایک ایسا عذاب نازل کروں گا، جس طرح میں نے تقسیم کرنے والوں پر نازل کیا ہے [2] جن لوگوں نے قرآن کو ٹکڑے کردیا ہے [3]

آیہ شریفہ میں جو لفظ المقتسمین آیا ہے، وہ تقسیم اور تجزیہ کرنے والوں کے معنی میں ہے البتہ یہ کہ اس آیہ شریفہ کا شان نزول کیا ہے اور کن لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے، اس سلسلہ میں تفسیر میں کئی احتمالات بیان کئے گئے ہیں:

1. کفار کے سردار، ایام حج میں سڑکوں اور مکہ میں داخل ہونے کی جگہوں پر بعض افراد کو تقسیم کر کے رکھتے تھے، تا کہ مسافروں کو کہدیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نامی ایک شخص نے کچھ دعویٰ کیا ہے، ایسا نہ ہو کہ اس کی بات کی طرف توجہ کریں اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کاہن، ساحر اور دیوانہ معرفی کرتے تھے

2. وہ گروہ جو آپس میں قرآن کو تقسیم کرتے تھے، تا کہ ان میں سے ہر ایک قرآن

مجید کے متشابہ کو لے آئے [4]

3. وہ لوگ جو قرآن مجید کے ایک حصہ پر عمل کرتے تھے اور ایک حصہ کو چھوڑ دیتے تھے [5]

4. قریش کا ایک قبیلہ تھا، جنھوں نے قرآن مجید کو پارہ کیا، کچھ لوگوں نے کہا سحر ہے، کچھ لوگوں نے کہا کہ پرانے لوگوں کا افسانہ ہے اور ایک جماعت نے کہا کہ جعلی ہے [6]

5. بعض لوگوں نے کہا: یہودی اور عیسائی اسلام سے پہلے ہیں اور دین میں تفرقہ اور اختلاف سے دوچار ہوئے اور مختلف فرقوں میں بٹ گئے، ہر فرقہ اپنی جگہ پر شاد تھا اور قرآن مجید کا مراد، آسمانی کتاب ہے

پانچویں احتمال کے بارے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ خدا کے پروگرام کسی شک و شبہ کے بغیر عام طور پر تمام انسانوں کے فائدے میں ہیں، لیکن بظاہر اور ابتدائی نظر میں عام طور پر بعض ہماری خواہش کے مطابق ہیں اور بعض ہماری خواہش کے خلاف ہیں اور یہاں پر سچے مومنین کو جھوٹے دعویٰ کرنے والوں میں پہچانا جاتا ہے، پہلا گروہ چون و چرا کے بغیر سبوں کو قبول کرتے ہیں حتی جہاں پر بظاہر ان کے نفع میں نہیں ہے اور کہتے ہیں: سب خدا کی طرف سے ہے [7] اور یہ لوگ احکام الٰہی میں کسی قسم کے تجزیہ، تقسیم، تبعیض کے قائل نہیں ہیں

لیکن جن کے دل بیمار ہیں اور دین اور حکم خدا سے اپنے منافع میں استفادہ کرنا چاہتے ہیں، وہ صرف اسی حصہ کو قبول کرتے ہیں جو ان کے نفع میں ہو اور باقی کو چھوڑ دیتے ہیں، وہ لوگ قرآن مجید کی آیات کو یہاں تک کہ کبھی ایک آیت کا بھی تجزیہ کرتے ہیں، اور اس کا جو حصہ ان کی مرضی کے مطابق ہو اسے قبول کرتے ہی اور دوسرے حصہ کو چھوڑ دیتے ہیں

یہ فخر و مباہات کی بات نہیں ہے کہ بعض گزشتہ اقوام کے مانند، نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ [8] کا نغمہ گائیں، کیونکہ تمام دنیا پرست یہی کام کرتے ہیں، حق و باطل میں جو حق کے پیروں کو پہچاننے کا معیار ہے، وہ وہی ان احکام و فرمان الٰہی کے سامنے تسلیم ہونا ہے جو ہمارے ظاہری نفسانی خواہشات کے موافق نہیں ہیں، یہیں پر خالص کو نا خالص سے اور مومن کو منافق سے پہچانا جاسکتا ہے [9]

اس بنا پر واضح ہوا کہ سورہ حجر کی آیت نمبر 90 سے خداوند متعال کا مراد قرآن مجید کے جعلی نسخوں کا موجود ہونا یا شائع ہونا نہیں ہے

ہماری نصیحت یہ ہے کہ جن آیات کے بارے میں شک وشبہ سے دوچار ہو جاؤ گو یا ان کے مفاہیم کو صحیح طور پر تجزیہ نہیں کرسکو گے تو ایسے مواقع پر قرآن مجید کے قابل اعتبار تفاسیر کا مطالعہ کرنا چاہئے

حواشی

[1] وَقُلْ اِنِّیْٓ اَنَا النَّذِیْرُ الْمُبِیْنُ، سورہ حجر، 89.

[2] كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِیْنَ، سورہ حجر، آیہ 90.

[3] الَّذِیْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ، سورہ حجر، آیہ 91.

[4] تفسیر نور، ج6، ص: 356.

[5] ترجمہ (فارسی) تفسیر المیزان، ج12، ص286.

[6] تفسیر ہدایت، ج5، ص401.

[7] كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا، سورہ آل عمران، 7.

[8] سورہ نساء، 150.

[9] تفسیر نمونہ، تفسیر و نکات آیات 85 الی 91 سورہ حجر.

بہت سی جگہوں پر قرآن مجید، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے کہ تم، لوگوں کے ایمان کے ذمہ دار نہیں ہو وغیرہ وغیرہ۔ کیا یہ امر بہ معروف اور جہاد ابتدائی کے منافی نہیں ہے؟

مختصر جواب

قرآن مجید کے نظریہ کے مطابق جہاد چاہے ابتدائی ہو یا دفاعی انسانی حقوق کے خاطر ہے اور توحید، انسانیت کا اہم ترین حق ہے توحید انسانی فطرت کی سب سے بہترین متاع ہے کہ جس کی حفاظت کے لئے اسلام نے جہاد کو تجویز کیا ہے اور امر بہ معروف و نہی عن المنکر بھی اسی فہرست میں ہے، لہٰذا اسلام نے مسلمانوں پر انسانیت کو گمراہی و ضلالت سے نجات دلانا واجب قرار دیا ہے تا کہ ایک مسلمان فقط اپنے ہی بارے میں نہ سوچے۔

ایسے میں مادی اسباب سے مدد لینا ضروری ہے، اگر قرآن مجید میں خداوند عالم نے پیغمبر کو لوگوں کے ایمان کا ذمہ دار قرار نہیں دیا ہے تو اس لئے کہ ایمان و اعتقاد ایک قلبی امر ہے جہاں جبر کی گنجائش نہیں ہے اور پیغمبر کا فریضہ یہ ہے کہ لوگوں کی ہدایت کی کوشش کریں۔ لیکن اس کے بعد سے یہ سوال نہیں کیا جائے گا کہ لوگ ہدایت یافتہ کیوں نہیں ہوئے۔

تفصیلی جواب

اس طرح کے سوالات کا جواب امر بہ معروف، نہی عن المنکر اور ابتدائی جہاد کی صحیح شناخت وتصور کی روشنی میں ممکن ہے۔

اسلام میں جہاد، مومنین کے لئے حیات بخش قرار دیا گیا ہے [1] یعنی جہاد چاہے ابتدائی ہو یا دفاعی، انسانی زندگی میں حق کے دفاع کی خاطر ہوتا ہے اس لئے کہ شرک انسانیت کی ہلاکت اور موت کا سبب ہے اور توحید و دین کا قانون، انسانیت کے اہم حقوق میں سے ہے جو اپنی جگہ مسلم اور ثابت ہو چکا ہے۔

اسلام نے جہاد کو اپنایا تا کہ زمین شرک کی آلودگیوں سے پاک ہو سکے۔ حقیقت میں یہ حکم ایک دفاعی حکم ہے یعنی انسانی حقوق کا دفاع محسوب ہوتا ہے اور اگر حیات انسان اسی بات پر منحصر ہو کہ یہ جائز حق، دلیلوں کے بیان کرنے کے بعد کچھ لوگوں پر لاگو کیا جائے تو کیا یہ عقل اور عقلاء کے اعتبار سے قبیح ہے؟ [2]۔

رہی بات امر بہ معروف و نہی عن المنکر کی تو یہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دے اور انسانیت کو گمراہی و ضلالت سے نجات دینے اور گناہوں سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے [3]۔

اس لئے کہ اگر بینی که نابینا و چاه است، اگر خاموش بنشینی گناه استیعنی اگرآپ دیکھے کہ کوئی اندھا کنویں کی طرف جا رہا ہےتو ایسی صورت میں خاموشی سے بیٹھے رہنا گناہ ہے۔

انسان کو اس کام کے لئے مادی اسباب سے مدد لینا چاہئے اور مسببات کو خدا کے حوالے کرنا چاہئے کہ (إلیه الأمرُ کلّه) ہر امر کی انتہا اس کی طرف ہے، یعنی انسان کا یہ فریضہ نہیں ہے کہ دوسرے کی نجات کی خاطر اپنے کو ہلاک کردے، اگر اس نے لوگوں کی

ہدایت کے سلسلہ میں کوتاہی نہیں کی ہے تو اسے ان کی گمراہی کی سزا بھی نہیں ملے گی۔

لَا یَضُرُّکُمۡ مَّنۡ ضَلَّ اِذَا اهۡتَدَیۡتُمۡ ؕ اِلَی اللّٰهِ مَرۡجِعُکُمۡ)[4]

اے ایمان لانے والو! اپنی حفاظت کرو جبکہ تم ہدایت پا چکے ہو اور گمراہوں کی گمراہی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی بیشک تو لوگوں کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

قرآن مجید دوسرے مقام پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہوکر فرمایا ہے

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ عَلٰۤی اٰثَارِهِمۡ اِنۡ لَّمۡ یُؤۡمِنُوۡا بِهٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَسَفًا ﴿۶﴾)[5]

شاید تم (اس فکر میں) اپنی جان ہلاک کر ڈالو گے یہ (کفار) مومن کیوں نہیں ہو جاتے۔

دوسرے یہ کہ دین کا عقیدہ ایک قلبی امر ہے جہاں جبر و اکراہ کی گنجائش ہی نہیں ہے ہر چند ظاہری اعمال، افعال اور بدن کی حرکت میں جبر و اکراہ بے تأثیر بھی نہیں ہے لیکن پھر بھی قلبی عقیدہ کے لئے علل و اسباب کی جستجو اور ان میں غور و فکر کرنا ضروری ہے [6]۔اسی لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہوتا ہے کہ

فَذَکِّرۡ ۟ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُذَکِّرٌ ﴿ؕ۲۱﴾ لَسۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِمُصَیۡطِرٍ ﴿ۙ۲۲﴾[7]

تو تم نصیحت کرتے رہو، تم تو بس نصیحت کرنے والے ہو تم کچھ اس پر داروغہ تو ہو نہیں کہ جو انہیں ایمان لانے پر مجبور کرو[8]۔

لہٰذا مذکورہ آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام میں جہاد کا مقصد زبردستی دین کا پھیلانا نہیں ہے بلکہ حق کو جلا دینا اور توحید کا دفاع کرنا ہے۔ اور توحید فطرت انسانی کی سب سے اچھی متاع ہے مگر لوگوں کے درمیان توحید کے پھیل جانے اور دین نبوت یا یہودیت یا مسیحیت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے بعد مسلمانوں اور موحد افراد کے درمیان کسی قسم کا

جھگڑا باقی نہیں رہتا۔

اور جو خدا اپنے پیغمبر سے فرما رہا ہے کہ تم، لوگوں کے اس کے معنی یہ نہیں کہ امر بہ معروف،

نہی عن المنکر اور جہاد وغیرہ کے ذریعہ ان کی ہدایت کرنا واجب نہیں ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ تم پیغام پہنچانے پر مامور ہو نہ کہ نتیجہ کے، یعنی ان کا ہدایت پانا ایک قلبی امر ہے اور تمہارے قبضہ قدرت میں نہیں ہے، لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ ان کے کام کو ہمارے سپرد کردو۔

حواشی

[1] سورہ انفال، آیت 24۔

[2] دیکھئے المیز ان، ج 2، صص 66۔71۔

[3] سورہ اعراف آیت 54، آل عمران آیت 104۔110، 114، توبہ آیت 67۔ 71، انبیاء آیت 73، یوسف آیت 108۔

[4] مائدہ آیت 105، بقرہ آیت 134۔((تلک امّۃٌ قد خلَت لھا ما کسبت ولکم ما کسَبتم وَلاتسئلونَ عمّا کانوایعمَلون))

[5] شعراء آیت 3۔ کہف آیت 6۔

[6] دیکھئے المیز ان، ج 2، ص 342، 343۔

[7] غاشیہ آیت 22۔

[8] دیکھئے المیز ان، ج 6، ص 162۔165۔

کیا یہ بات درست نہیں ہے کہ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق اولیائے خدا کو نہ خوف ہوتا ہے نہ غم (یونس، ٦٢) پھر روز جمعہ کی دعا میں امام زمانہ علیہ السلام سے خطاب کر کے ہم یہ کیوں کہتے ہیں: السلام علیک ایھا المھذب الخائف یعنی سلام ہو آپ پر اے خوف زدہ رہنے والے پاک باطن؟

مختصر جواب

خوف و ہراس دو طرح کا ہوتا ہے۔ قابل تعریف اور قابل مزمت، برے اور قابل مزمت خوف کی مثال جیسے زمانہ سے ڈرنا، لوگوں سے ڈرنا، اور۔۔۔۔ یہ چیزیں اللہ کے دوستوں کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اسی لئے امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے مومن خدا کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتا اور قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق یہ صرف شیطان ہے جو اپنی پیروی کرنے والوں کو ڈراتا ہے۔ ان سے نہ ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو مجھ سے ڈرو۔

لیکن پسندیدہ اور قیمتی خوف اللہ کے جلال اور اس کی عظمت سے خوف ہے۔اس بارہ میں حقیقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص خدا کی جس قدر معرفت رکھتا ہو اس کی عظمت سے اتنا ہی خوف زدہ ہے۔

پسندیدہ خوف خاص لوگوں اور بزرگوں کا خوف ہے جو خدا کی عظمت وجلال اور دل پر اس کے اسماء کی تجلی سے حاصل ہوتا ہے اور حق کی عظمت سے حاصل ہونے والا خوف معنوی لذتوں میں سے ہے اور اس کا اس آیت کریمہ سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾

بلکہ یہ خوف کاملوں کے صفات کمال میں سے ہے۔اسی وجہ سے ہم حضرت صاحب الزمان علیہ السلام کی خدمت میں عرض کرتے ہیں: سلام ہو آپ پر اے پاک باطن خوف زدہ یعنی حق کی جلال و جبروت سے خائف رہنے والے۔

تفصیلی جواب

خوف و ہراس دو طرح کا رہتا ہے۔اچھّا اور پسندیدہ خوف اور برا و مذموم خوف۔غلط اور برا خوف اللہ کے بندوں کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا، یہ زمانہ کا خوف،لوگوں کا خوف،دشمن کا ڈر مختصر یہ کہ مخلوقات کا ڈرا ہے۔

جناب ابوذر سے نقل ہے کہ انہوں نے فرمایا: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے وصیت کی کہ خدا کی راہ میں کسی بھی ملامت کرنے والے کہ ملامت سے نہ ڈروں [1]۔امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا:

مومن خدا کے علاوہ کسی سے بھی نہیں ڈرتا [2]۔قرآن کریم کا ارشاد ہے: یہ صرف شیطان ہے جو اپنی پیروی کرنے والوں کو (اپنی افواہوں اور بے بنیاد باتوں سے) ڈراتا ہے پس ان لوگوں سے نہ ڈروں اور مجھ سے ڈروں اگر ایمان رکھتے ہو [3]

اور جو خوف و ہراس پسندیدہ اور قیمتی ہے وہ اللہ کے جلال وعظمت کا خوف ہے۔امام علی علیہ السلام کا ارشاد ہے: خوف عارفوں کا لباس ہے [4]۔حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

جو شخص خدا کی جتنی زیادہ معرفت رکھتا ہوتا ہے اس سے اتنا ہی خوف زدہ ہوتا ہے[5] اسی وجہ سے آپ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خدا سے مرا خوف تم سب سے زیادہ ہے[6] اور اسی قیمتی، پسندیدہ خوف کا ثمرہ و فائدہ یہ ہے کہ انسان خدا کی بارگاہ میں پناہ لے لیتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا: اگر مخلوقات سے ڈرتے ہوتو ان سے بھاگتے ہو لیکن اگر خالق سے ڈرتے ہوتو اس کی پناہ میں جاتے ہو[7]

خوف کے درجات:

خواجہ عبد اللہ انصاری کے بقول: تواضع و فروتنی سے خوف پیدا ہوتا ہے۔ارشاد پروردگار ہے:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ

خوف ڈر ہے، ڈر ایمان کا حصار ہے، تقوا کے لئے تریاق (دوا) اور مومن کے لئے اسلحہ ہے اور اس کی تین قسمیں ہیں، ایک خاطر و خیال ہے دوسرا مقیم اور رہ جانے والا ہے اور تیسرا غالب ہے۔وہ خوف جو خیالی ہے اور آنے جانے والا ہے، دل میں آتا ہے اور گذر جاتا ہے، وہ پست قسم کا خوف ہے کہ اگر وہ نہ ہوتا تو ایمان نہ ہوتا کہ خوف کے بغیر سلامتی نہیں اور بے خوف کے پاس ایمان نہیں ہے۔ ہر شخص کا ایمان اتنا ہی ہے جتنا اس کا خوف ہے۔ دوسرا خوف مقیم ہے یعنی برابر رہتا ہے۔ یہ بندے کو گناہوں سے روکتا ہے، اسے حرام سے دور رکھتا ہے اور اس کی آرزوں اور تمناوں کو مختصر کرتا ہے۔تیسرا خوف غالب ہے یہ ترس مکر ہے۔ یہ وہ

ڈر ہے جو حقیقی ہے۔اس سے اخلاق کی راہیں کشادہ ہوتی ہیں اور اس کے ذریعہ انسان غفلت سے دور رہتا ہے۔مکر کی دس نشانیاں ہے: بے رغبتی کی عبادت،توبہ کے بغیر گناہ پر اصرار، گناہ کا در بند ہونا،علم جس کے ساتھ عمل نہ ہو، بے ارادہ کی حکمت، بد اخلاقی کی صحبت،تضرع و زاری کا دروازہ بند ہونا، برے افراد کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور ان سب سے بدتر یا بندہ کو بے یقین ایمان دیتا ہے یا بندہ کو اس کے حوالہ کر دیتا ہے۔[8]

اس کی رضایت یہ ہے ؛حقیقت خوف یہ ہے کہ سالک اپنے مطلوب کے حصول سے نا امید یا کسی بری افتاد کے وقوع کا منتظر ہوجائے،اطمینان کی حالت سے خارج اور اضطراب میں مبتلا ہوجائے۔سالک کے ارتقاء کے لحاظ سے خوف کی تین قسمیں ہیں:

ایک عامہ کا خوف: یہ عذاب وعقوبت الٰہی کا خوف ہے کہ چونکہ سالک اپنے معبود کے سطوت وجلال سے آگاہ ہوگیا ہے لہٰذا مضطرب و پریشان ہے۔خداوند عالم فرماتا ہے:

يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ ﴿٣٧﴾

وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور نگاہیں حیران و پریشان ہیں۔[9]

دوسرے متوسطین یعنی درمیان کے لوگوں کا خوف ہے اور وہ مکر الٰہی سے خوف ہے کہ اہل مراقبہ جو خدا کی بارگاہ میں حضور کے ذوق سے آشنا ہوگئے ہیں،اس میں مبتلا ہیں کہ وہ برابر اس خوف میں ہیں کہ کہیں یہ فیضان الٰہی تمام نہ ہوجائے اور بارگاہ الٰہی میں حضور کی لذّت محو نہ ہوجائے۔اگر چہ اس منزل سے واقف افراد خود شبہ میں مبتلا ہیں کہ خود فیاض (یعنی خدا) سے دور ہوگئے ہیں اور فیض سے وابستہ ہوگئے ہیں۔خداوند عالم فرماتا ہے:

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ ﴿٤٦﴾[10]

خود خدا کے مقام قہر و کبریائی سے ڈرے اس کے لئے دہری جنتیں ہیں۔

تیسرا خوف بزرگوں اور اہل دل حضرات کا ہے جو حریم الٰہی میں اس کے جمال کے

عاشق ہیں اور اس کے جمال کی زیبائی اور جلال کی رعنائی میں ایسے محو ہو گئے ہیں کہ اس کا جمال با کمال نے ناز کا جلوہ اختیار کر رکھا ہے اور خدائے عزیز و بے نیاز نے اپنی ہیبت مقتول عشق پر طاری کر دی ہے اسی کی طرف سعدی شیرازی نے اشارہ کیا ہے کہ:

گر کسی وصف او زمن پرسد بیدل از بی نشان چه گوید راز

عاشقان کشتگان معشوقند بر نیاید ز کشتگان آواز[11]

ترجمہ اردو:

مجھ سے پوچھے کوئی جو اس کا پتا میں ہو بیدل وہ بے نشاں ہے کہاں؟

ہیں جو عشاق کشتہ معشوق جسم مقتول ہے فغاں ہے کہاں؟

پس خواص اور اولیاء کے حالات دوسروں کے حالات سے جدا ہیں۔ اللہ کی عنایت وجلال کا مشاہدہ اور اسمائے الٰہی کی تجلی ان کے دلوں پر برابر بڑھتی جاتی ہے اور وہ اس کی روحانی لذت میں غرق رہتے ہیں۔ اس قسم کا خوف سورہ یونس کی اس آیت سے، جس میں کہا گیا ہے کہ: آگاہ ہو جاؤ کہ اولیائے خدا کو نہ کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ کوئی غم، کوئی ٹکراؤ نہیں رکھتا۔[12]

اسی وجہ سے ہم اپنے مولا و آقا اور امام زمانہؑ کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں: سلام ہو آپ پر اے خوف زدہ پاک باطن اور حق کے جلال و جبروت سے خائف رہنے والے۔

حواشی

[1] علامی مجلسی، بحار الانوار ج 71 ص 360۔

[2] ری شہری محمد، میزان الحکمۃ، ج 3 روایت نمبر 5258۔

[3] آل عمران، 175۔

[4] ری شہری محمد، میزان الحکمۃ، ج 3 روایت نمبر 5178۔

[5] ری شہری محمد، میزان الحکمۃ، ج 3 روایت نمبر 5195۔

[6] نراقی ملا احمد، معراج السعادۃ، باب چہارم، صف پنجم، مقام سوم، خوف الٰہی۔

[7] ری شہری محمد، حسینی سید محمد، منتخب میزان الحکمۃ، روایت نمبر 2000۔

[8] انصاری خواجہ عبداللہ، صد میدان، میدان سی وسوم، ص 63۔

[9] نور، 37۔

[10] الرحمٰن، 46۔

[11] دامادی، سید محمد شرح مقالات اربعین، یا مبانی سیر وسلوک عرفانی، ص 145۔

[12] امام خمینیؒ، شرح چہل حدیث، ص 230۔231۔

انسان کس طرح خدا کا محبوب بندہ بن سکتا ہے؟

مختصر جواب

یہ دوستی دو پہلو سے قابل تصور ہے:

۱۔ بندہ خدا کو چاہے اور خداوند عالم اس کا محبوب ہو

۲۔ خدا بندہ کو چاہے اور بندہ خدا کا محبوب ہو۔ سوال بھی اسی دوسری قسم کے بارے میں ہوا ہے۔

یوں تو عالم وجود کی ہر شئ، خدا کی مخلوق اور اس کا پرتو ہونے کے لحاظ سے خدا کی محبوب ہے، لیکن وہ محبت جس کا تذکرہ آیات اور روایات میں آیا ہے وہ ایک خاص قسم کی محبت ہے، جہاں بندہ خداوند عالم کے خاص لطف وعنایت سے فیضیاب ہوتا ہے، دل کے غبار چھٹ جاتے ہیں اور باطن منور ہوجاتا ہے؛ خدا اور بندہ کے درمیان سے سارے حجاب ہٹ جاتے ہیں۔۔۔

آیات وروایات کی روشنی میں خدا سے قربت حاصل کرنے اور اس کے محبوب ہونے کی بہت سی راہیں بیان ہوئی ہیں؛ کچھ کلی عناوین کے تحت اور کچھ جزئی اور تفصیلی موارد کے ساتھ ؛ جیسے: خدا اور قیامت پر ایمان، اور خداوند عالم کو محبوب رکھنا؛ انبیاء الٰہی اور نبی ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی تصدیق، ائمہ معصومین علیہم السلام کی ولایت کو تسلیم کرنا، ان کی اطاعت اور پیروی،، اور ان ذوات مقدسہ سے محبت؛ کفر وشرک ونفاق سے دوری، عقیدہ میں علم ومعرفت۔

عمل میں دین و شریعت کی مکمل تعمیل اور احکام الٰہی میں امتیاز نہ برتنا؛ خدا رسول اور ائمہ طاہرین کی بے چون و چرا مکمل اور محض تبعیت ؛ دین خدا اور خلق خدا میں فساد اور طغیان نہ کرنا اور حدود الٰہی کو پار نہ کرنا؛

اخلاق میں اپنے نفس اور باطن کو پاکیزہ حالات و ملکات وصفات حمیدہ سے آراستہ کرنا اور نازیبا صفات وحرکات سے دوری اختیار کرنا۔۔۔

یہ چیزیں خدا رسول اور ائمہ طاہرین کی بارگاہ میں قربت، منزلت اور ان کی محبوبیت کا سبب بنتی ہیں اور یہی ایک انسان کی خلقت کا حقیقی مقصد اور منزل کمال ہے، جسے ہم قرب عند اللہ کہتے ہیں۔

تفصیلی جواب

خداوند عالم کے سلسلہ میں محبت دو پہلوؤں کے ساتھ قابل تصور ہے:

۱۔ بندہ خدا کو چاہے، اس سے محبت کرے اور خدا بندہ کا محبوب ہو

۲۔ خدا بندے کو چاہے اور بندہ خدا کا محبوب ہو

اسی کی طرف خداوند عالم اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

(يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ)[1] خدا بندوں سے محبت کرتا ہے اور بندے خدا سے۔

البتہ سوال دوسرے پہلو کے بارے میں ہوا ہے کہ کس طرح بندہ خدا کا محبوب بن سکتا ہے؟

اس سوال کے جواب سے پہلے دو بات کی طرف توجہ نہایت ضروری ہے

الف۔ عشق اور محبت کا مرتبہ ایک بلند اور عظیم مرتبہ ہے۔ اس بحث کی وسعت اور اہمیت کے پیش نظر اگر اس سلسلہ میں سیر حاصل بحث کی جائے تو بات بہت طولانی ہو جائے گی اور اصل مقصد فوت ہو جائے گا خاص کر آیات، روایات، دعاؤں اور دیگر دینی

کتابوں میں اس سلسلہ میں ایسے ایسے عظیم نکات موجود ہیں کہ ان کو بیان اور تشریح کرنے کے لئے مستقل ایک کتاب کی ضرورت ہوگی۔

ب۔ خداوند عالم چونکہ ذات کامل اور جمال مطلق ہے لہٰذا اپنی ذات اور اپنے کمالات سے محبت کرتا ہے، اسی بنا پر اپنی مخلوقات اور اپنے آثار سے بھی محبت کرتا ہے جو کہ اس کے کمالات اور جمال کا پرتو ہیں۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں ارشاد ہوا ہے: **كنتُ كنزاً مخفياً فأَحبَبتُ أن أُعرَف، فخلقتُ الخَلقَ لِكَي أُعرَف**[2]۔ میں چھپا ہوا خزانہ تھا پس میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو میں نے خلائق کو خلق کیا تا کہ پہچانا جاؤں۔

گنج مخفی بد ز پرّی چاک کرد

خاک را روشن تر از افلاک کرد[3]

عالم وجود کی خلقت کی بنیاد محبت اور عشق ہے جو خداوند عالم اپنے کمالات و جمال سے کرتا ہے۔ خداوند عالم نے اپنا جمال ظاہر کرنا چاہا تو خلقت کو اپنے جمال کا آئینہ بنالیا۔ ہر شئے خدا کے جمال و کمال کے کسی ایک گوشہ کی عکاس بن گئی؛ اسی لئے ہر شئے خدا کی آیت ہے۔

نویں صدی کے نامی گرامی عارف واصل عبد الرحمن جامی فرماتے ہیں:

در آن خلوت که هستی بی نشان بود

وجودی بود از نقش دوئی دور

ز گفت وگوی مائی و توئی دور

جمالی مطلق از قید مظاهر

به نور خویشتن بر خویش ظاهر

جمال اوست هر جا جلوه کرده

ز معشوقان عالم بسته پرده

اس بنا پر عالم وجود کی ہر شئے خداوند عالم کی محبوب ہے۔[4]

لیکن اس سوال میں جو پوچھا گیا ہے وہ ایک خاص محبت کے بارے میں ہے جس کی مزید وضاحت انشاء اللہ آگے اور آئے گی؛ کہ انسان کس طرح خدا کا خاص محبوب بندہ بن سکتا ہے؟

خدا کے مجذوب اور محبوب ہونے کا امکان:

سب سے پہلے تو سوال یہ ہے کہ کیا خداوند عالم کسی سے متأثر ہوسکتا ہے؟ کیا کوئی اس قابل ہوسکتا ہے کہ خدا کا محبوب بن سکے؟ وہ خدائے رحمٰن و رحیم اپنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو حکم اور پیغام دیتا ہے اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ایسا ممکن ہے کہ مؤمنوں میں اس کے خاص بندے خداوند عالم کے محبوب قرار پائیں، قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ [5](کہہ دو اگر تم خدا کو چاہتے ہو تو میری اطاعت کرو تو اللہ بھی تم سے محبت کرے گا)۔ سورہ مائدہ میں ارشاد ہوتا ہے يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ [6] (خدا بندوں سے محبت رکھتا ہے اور بندے خدا سے محبت رکھتے ہیں)۔ حدیث قدسی میں ارشاد ہوتا ہے، لَو علمُ المُدبِرون کیف اشتیاقی بهم لماتوا شوقا [7](اگر مجھ سے منہ پھیرنے والے بندوں کو یہ معلوم ہوجائے کہ میں ان کا کتنا مشتاق ہوں تو وہ شدّت شوق سے مر جائینگے)۔ ایک اور مشہور معروف حدیث قدسی میں جو امام صادق علیہ السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں، خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: انّه ليتقرب اليَّ بالنافلةِ حتّى اُحِبُّهُ [8](بندہ نماز نافلہ کے ذریعہ میری قربت حاصل کرے تا کہ میں اس سے محبت کرنے لگوں)۔

خدا کا محبوب ہونا

خدا کی محبت بندوں سے اور بندوں کی محبت خدا سے، کے بہت سے معنی اور مفہوم ہو سکتے ہیں لیکن اس معنی میں ہرگز نہیں ہے جس معنی میں انسان آپس میں محبت کرتے ہیں، اس سلسلہ میں جو کہا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ اس محبت کی تاثیر یہ ہے کہ خدا اپنے محبوب بندوں سے ایک ایک کر کے حجابات کو اٹھا لیتا ہے اور وہ دل کی آنکھوں سے جمال الٰہی کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے اور اس کی بارگاہ قربت حاصل کر لیتا ہے؛ اور ازل سے خداوند عالم کا ارادہ کہ ایسے بندوں کے باطن کو پاکیزہ، روشن اور منوّر کرے تا کہ اس کے سوا کسی چیز کو اپنے دل میں جگہ نہ دے، اپنے اور بندے کے درمیان تمام رکاوٹیں دور کر دے تا کہ حق کے سوا کچھ نہ سنے، اس کے علاوہ کسی اور کی بات بندے کے کانوں سے نہ ٹکرائے اور اپنے چشم باطن سے سوائے اس کے کسی اور کو نہ دیکھے اور خدا کی زبان کے علاوہ کسی اور زبان سے گفتگو نہ کرے [9]

خدا کا محبوب ہونے کی راہیں:

خدا کی بارگاہ میں محبوبیت حاصل کرنے کی اہم ترین راہیں یہ ہیں کہ انسان تفصیلی طور پر یہ سمجھے کہ خداوند عالم کیا چاہتا ہے اور کس چیز میں اس کی مرضی پوشیدہ ہے تا کہ اس کی مرضی پہ چل کے اور اس کے امر و احکام کی تعمیل کر کے اس کی عنایت اور توجہات کا مستحق قرار پائے اور مرحلہ بہ مرحلہ اس کی قربت حاصل ہو جائے اسی طرح اپنی حاصل شدہ محبوبیت کو برقرار رکھنے کے لئے بھی اپنی آخری سانس تک یہ سلسلہ قائم رکھنا ہوگا۔

اس کے علاوہ یہ بھی تفصیلی طور سے جاننا ہوگا کہ خداوند عالم کن چیزوں سے کراہت رکھتا ہے اور کیا چیزیں اس کے غضب و لعن و عذاب کا سبب بنتی ہیں اور کن چیزوں سے پرہیز

کرنے کو کہا گیا ہے، تا کہ ان سے دور رہے اور اگر ان میں گرفتار ہے تو اپنے آپ کو ان سے نکال کے آزاد کرے تا کہ رب العزّت کی درگاہ میں محبوب قرار پائے۔ اس سلسلہ کو بھی عمر کی آخری سانس تک برقرار رکھنا ہوگا؛ تا کہ راندہ درگاہ الٰہی نہ ہو اور خدا کے غضب و عذاب میں مبتلا نہ ہو۔

اور اس مذکورہ معرفت کو حاصل کرنے کی سب سے آسان اور مطمئن راہ، قرآن کی آیات اور معصومین کی روایات ہیں کیونکہ قرآن کریم تحریف سے پاک و منزّہ ہے اور خداوند عالم نے اس میں ہر وہ چیز بیان کر دی ہے جس میں اس کی رضایت شامل ہے؛ ایمان اور عمل اس کی بارگاہ میں محبوبیت کا وسیلہ ہیں، جس کی بنا پر خدا کی رحمتیں اس کو اپنے دامن میں لے لیتی ہیں، تاہم یہ بات بھی واضح ہے کہ ان میں سے کوئی بھی صرف ایک یعنی صرف عقیدہ یا عمل یا ان دونوں کا دکھاوا، خداوند عالم کے غضب اور اس کی بارگاہ سے نکالے جانے اور جہنم کے گڑھوں میں جھونکے جانے کا سبب بن سکتی ہے۔ اگر انسان اپنے آپ کو عقیدہ و عمل اور اخلاق میں مکمل طور سے قرآن کریم سے منطبق کر لے؛ اور اس سلسلہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت کو اپنے لئے نمونہ عمل قرار دے، تو اپنے اس مطلوب اور مقصود یعنی پروردگار عالم کی خوشنودی، خدا کے نزدیک محبوبیت، اس کے غضب و لعن و عذاب سے نجات ضرور پا لے گا۔

آیات و روایات کی روشنی میں خدا سے قربت حاصل کرنے اور اس کے محبوب ہونے کی بہت سی راہیں بیان ہوئی ہیں؛ کچھ کلی عناوین اور معیارات کے تحت اور کچھ جزئی اور سیر و سلوک کے تفصیلی موارد اور مصادیق کے ساتھ راہ کمال کے سالکوں کو ہدایتیں دیتی ہیں۔

کلی عناوین و معیارات جیسے:

۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی:

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ بندہ کی محبوبیت کے سلسلہ میں خداوند عالم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کو شرط قرار دیا ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ اعلان کر دیں کہ

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ [10]

کہہ دو اگر تم خدا کو چاہتے ہو تو میری اطاعت کرو تو اللہ بھی تم سے محبت کریگا۔

اس بنا پر اس آیت میں محبت الٰہی کا معیار و ضابطہ کلی، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گفتار و کردار و سیرت کی اطاعت اور پیروی کو قرار دیا گیا ہے اور قرآن مجید کی بہت سی آیتوں سے اس پیروی کی تاکید کی ہے

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ [11]

جو تعلیمات رسول تمہیں دیں اس پر عمل کرو

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ [12]

(خدا کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو)

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا

خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں اختلاف نہ کرو) [13]

۲۔ واجبات، نوافل اور مستحبات کا بجالانا:

بے شمار اور معتبر احادیث میں جو احادیث قرب فرائض اور قرب نوافل کے نام سے جانی جاتی ہیں، خدا کے محبوب ہونے کی راہ کو، واجبات نوافل اور مستحبات کو انجام دینا بتایا

گیا ہے۔ اس سلسلہ میں تمام احادیث کو ذکر کرنے، اور قرب فرائض اور قرب نوافل کے فرق کو بیان کرنے سے بات بہت طولانی ہو جائے گی لہٰذا مختصر عرض کرتے ہیں کہ امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے میرے بندے واجبات سے بھی زیادہ محبوب عبادتوں کے ذریعہ میرا قرب کیوں نہیں حاصل کرتے، یقیناً جو مسلسل نافلوں اور مستحبات کے ذریعہ میری بارگاہ میں قربت حاصل کرتا اور اس منزل پر پہنچتا ہے جسے میں دوست رکھتا ہوں اور جب میں اسے دوست رکھتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ کاموں کو انجام دیتا ہے، اور۔۔۔[14]

اسی طرح کی روایت امام باقر علیہ السلام سے بھی منقول ہے [15]۔

اس طرح کی روایات میں غور کرنے سے خداوند کی بارگاہ میں محبوب ہونے کے اثرات اور اس کے تابناک نتائج کا بھی واضح طور سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے؛ جس کا حاصل باطن کا نورانی ہونا، حجاب کا برطرف ہونا، قرب الٰہی کے مقام پر فائز ہونا، اور یہ سب اس کے لطف و کرم و عنایت کا فیض اور اس کی محبت کا نتیجہ ہے [16]۔

ایمان خود محبت الٰہی کا ثمر بتایا گیا ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روایت میں ارشاد ہوتا ہے:

انّ اللّٰہ یعطی الدنیا من یحبّ و من لا یحب و لا یعطی الایمان الاّ من یحب[17]

خداوند عالم دنیا دیتا ہے جسے دوست رکھتا ہے اور جسے دوست نہیں رکھتا؛ لیکن ایمان اسی کو دیتا ہے جسے دوست رکھتا ہے۔

کیونکہ محب اور محبوب کا رابطہ لطف و التفات کا رابطہ ہے جس کے اظہار سے محب اور محبوب کی محبت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس کے اندر ایک تڑپ سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لئے دعائے ندبہ کے فقروں میں ملتا ہے:

اَللّٰهُمَّ وأقبل اَلَينا بِوَجهِكَ الكَريم وَ اقبل تَقَرُّبَنا اليكَ و انظُر الينا نَظرة رَحيمة نَستَكمِلُ بِها الكِرامَةَ عِندَك ثُمَّ لا تَصرِف ها عَنّا بِجُودِكَ[18]

خدایا ہماری طرف اپنے کرم کی صورت سے رخ کر اور اپنی رحمت کی نگاہوں سے ہماری طرف نظر کر جس سے تیرے حضور ہماری کرامت کمال تک پہنچے، پھر اپنے جود و کرم کو ہم سے دریغ نہ فرما۔

اب تک بارگاہ الٰہی میں محبوبیت حاصل کرنے کے عام ضوابط اور معیارات کی طرف روشنی ڈالی جا چکی؛ اب اس کے بعض جزئی موارد کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے؛ جسے قرآن کی آیتوں میں محبوب عنداللہ (خدا کے نزدیک پسندیدہ) کے عنوان سے پہنچوایا گیا ہے:

محبوب عنداللہ:

ایمان، خدا اور رسول کی اطاعت، نیک کاموں کی طرف عجلت، خطاؤں کی بھرپائی، خداوند عالم سے طلب مغفرت، خدا کی راہ میں آشکار اور پنہاں انفاق کرنا، غصہ کو پی جانا لوگوں کی غلطیوں کو درگذر کرنا اور ان سے نیکی سے پیش آنا جو ہمیشہ خدا کی یاد میں مصروف رہتے ہیں اور اپنی خطاؤں پر اصرار نہیں کرتے اور ربا نہیں کھاتے[19]

خدا پر توکل رکھتے ہیں۔ پریشانیوں میں صابر اور برد بار رہتے ہیں اور زبان پر شکوے کے الفاظ نہیں لاتے۔ اپنے کاموں کے لئے نیک لوگوں سے مشورہ کرتے ہیں۔

لوگوں سے نرمی اور لطافت کے ساتھ پیش آتے ہیں[20]۔

متقی اور پرہیزگار ہیں۔ خدا رسول اولیاء اور لوگوں سے کئے ہوئے وعدوں کے پابند ہیں اور اسے نبھاتے ہیں[21]

توبہ و اخلاص کے ذریعہ اپنے تقویٰ کی طہارت کرتے ہیں، بیہودگی اور آلودگی سے دور رہتے ہیں[22]۔

اپنے کان، آنکھ، زبان، پیٹ، اور بدن کے ہر عضو کو حرام سے روکے رکھتے ہیں[23] اپنے والدین کا احترام کرتے ہیں، اپنے خاندان اور رشتہ داروں کی حرمت کا پاس و خیال رکھتے ہیں[24] اولیائے دین خاص کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر درود و احترام کے ساتھ کرتے ہیں[25] حکومت یا قضاوت کا منصب پاتے ہیں تو عدل و انصاف کو اپنا شعار بناتے ہیں[26]

خدا کی راہ میں خرچ کئے پر افسوس نہیں کرتے۔ اگر مال و دولت و منصب پر فائز ہوئے تو گھمنڈ نہیں کرتے[27]، خدا کی راہ میں دل و جان و مال کو نچھاور کرتے ہیں[28]

روایات:

روایات میں بھی خدا کی محبت اور قربت حاصل کرنے کی بہت سی راہیں بیان ہوئی ہیں:

جو خدا کو پسند ہے وہی پسند کرنا[29]

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی آل علیہم السلام کو دوست رکھنا[30]

خدا سے محبت رکھنا[31]

علم و معرفت کے حصول میں لگے رہنا[32]

خدا کی تہلیل و تسبیح و تکبیر میں مشغول رہنا[33]

عمل خیر میں جلدی کرنا اور اس پر قائم رہنا[34]

اور۔۔۔

مبغوض عند اللہ:

اسکے مقابلہ میں مندرجہ ذیل گروہ خدا کے نزدیک مبغوض، ملعون اور راندہ درگاہ ہیں:

کافر[35] مشرک[36]

منافق[37] تکبر[38]

ضدی ٹکراؤ رکاہنا[39]

اکڑ کے فخر جتانے والے جو صرف اپنے پہ ناز کرتے ہیں[40]

اپنی حد سے گذر جاتے ہیں اور خدا و خلق خدا کے حقوق کا پاس و لحاظ نہیں کرتے[41]

عیاش اور عیش پرور[42]

اسراف کرنے والے[43]

خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے والے[44]

اپنے مال کو خدا کی بتائی ہوئی صحیح راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ کنجوسی، حسد اور کینہ پروری سے کام لیتے ہیں[45]

عہد توڑنے والے؛ کفار اور دشمنان دین سے دوستی رکھنے والے ان کا ہاتھ بٹانے والے ہیں[46]

احسان فراموش اور خیانتکار ہیں[47]

انبیاء، اولیاء اور مؤمنوں کے قتل سے دریغ نہیں کرتے[48] باغی اور گنہگار ہیں[49]

اپنے اور لوگوں پر ستم کرتے ہیں؛ اور خدا کے حقوق کی رعایت نہیں کرتے[50]

خدا کی بارگاہ میں دعا، توبہ، گریہ و زاری، اظہار ندامت، پرہیزگاری کا خیال اور اس کا پاس و لحاظ رکھنے کے عادی نہیں ہوتے۔ خدا سے بھی اکڑ کے مغرور رہتے ہیں [51] دین میں تحریف کرتے ہیں [52] طاغوت اور شیطان کی پیروی کرتے ہیں [53]

لوگوں کی ہدایت کے راستہ میں آڑے آتے ہیں۔ دین داروں میں تفرقہ ڈال کر انہیں گمراہ کرتے ہیں [54] زبان کے بُرے ہوتے ہیں اور جو کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے [55] خدا، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولیاء کو اپنے اعمال اور کرتوت سے اذیت پہنچاتے ہیں [56]

خدا کی راہ میں جہاد اور اس کی راہ میں جان و مال کو خرچ کرنے سے بہانے تراش کر دور بھاگتے ہیں [57] ناشکرے، گناہوں کے عادی [58] اور فاسقوں کے پیروکار ہوتے ہیں [59]

عمل صالح اور خدا، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولیاء پر ایمان رکھنے سے ناطہ نہیں رکھتے؛ ان سے اپنا رابطہ توڑ کے ان کے دشمنوں سے ملے ہوتے ہیں [60]

اب اگر ہم واقعی خدا کی رحمت و عنایت و محبت کے طالب ہیں، تو عزم راسخ کے ساتھ اپنے آپ کو دوسرے گروہ سے جدا کریں، اور پہلے گروہ سے منسلک ہو جائیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، دین کی تبلیغ و ترویج، اسلام و مسلمین و تشیع کی عظمت کی پاسبانی کر کے خود بھی خدا سے راضی ہوں اور خدا کو بھی اپنے سے راضی کریں؛ خدا، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اور اولیاء کو محبوب رکھیں اور ان ذات مقدسہ کے محبوب بھی ہوں [61] انشاء اللہ

حواشی

[1] مائدہ۔ ۵۴

[2] بحار، ج ۸۴، ص ۱۹۸

[3] مولوی مثنوی

[4] ابن سینا، اشارات وتنبیہات، ج ۳، ص ۳۶۳۔ ۳۵۹۔ صدر المتألہین، اسفار، ج ۷، ص ۱۶۰۔ ۱۴۸

[5] آل عمران۔ ۳۱

[6] مائدہ۔ ۵۴

[7] شیخ محمد بہاری (رہ)،تذکرۃ المتقین ص134

[8] کلینی ،کافی ،کتاب الایمان والکفر ،باب من أذی المسلمین واحتقر یم،ج 7،ص253۔بحار الانوار،ج 70۔کتاب الایمان والکفر ،مکارم الاخلاق،ص16،ح8۔

[9] فیض کاشانی،ملا محسن،اخلاق الحسنۃ،ص239۔238

[10] آل عمران 31

[11] حشر۔7

[12] نساء۔59

[13] انفال۔46

[14] کلینی ،کافی ،ج2،ص352،ح7

[15] کلینی ،کافی ،ج2،ص352،ح8

[16] اخلاق الحسنۃ،ص238

[17] فیض کاشانی،ملا محسن،محجۃ البیضاء،ج8،ص64

[18] محدث قمی،شیخ عباس،مفاتیح الجنان،دعای ندبہ

[19] آل عمران۔130،136،146،148۔

[20] آل عمران۔3،146،159،160۔

[21] آل عمران۔76۔توبہ۔4،7۔

[22] توبہ۔108،222۔

[23] مومنون۔1،11۔نور۔30،31۔احزاب۔70،71

[24] لقمان۔14،15

[25] احزاب۔56۔حجرات۔2،5

[26] حجرات۔9۔مائدہ۔42

[27] حدید۔23

[28] صف 23۔آل عمران 154،158

[29] بحارالانوار،ج 70،ص70 ح4

[30] بحارالانوار،ج 57،ص198 ،ح145

[31] بحارالانوار،ج 70،ص18 ،ح9

[32] بحارالانوار،ج 70،ص304،ح18

[33] محجۃ البیضاء،ج 2 ص275

[34] بحارالانوار،ج 71،ص216،ح18 ۔ نیزص322،ح33

[35] بقرہ۔ 89 90،روم۔ 45 آل عمران۔ 32

[36] لقمان۔ 13

[37] فتح۔6۔توبۃ۔ 28 سے آخر سورہ تک

[38] نحل۔23

[39] شوری۔16 ۔اعراف۔71

[40] حدید۔23۔نساء۔ 36۔لقمان۔18

[41] بقرہ۔190 ۔اعراف۔55

[42] قصص۔ 76

[43] اعراف۔ 31۔انعام۔141

[44] قصص۔ 77۔طٰہ۔ 81۔ مائدہ۔64۔ بقرہ۔205

[45] گذشتہ مدرک

[46] مائدہ۔50،63،80۔رعد۔20،25

[47] حج۔38۔ انفال۔58۔نساء۔107

[48] نساء۔93۔آل عمران۔112۔ بقرہ۔61

[49] حجرات۔7

[50] شوری۔40۔آل عمران۔57،140

[51] اعراف۔55

[52] مائدہ۔78۔ ہود۔18

[53] ہود۔59،60۔نساء۔48،54،115،118۔احزاب۔64،68

[54] اعراف۔44،45

[55] صف۔2،3۔حجرات۔11،12۔نور۔23۔نساء۔148

[56] احزاب۔57،58

[57] انفال۔16

[58] بقرہ۔276

[59] ہود۔59،60

[60] رعد۔20،25

[61] فجر۔28۔آل عمران۔31

اگر بہشت کی لذتیں ملیں اور افسردگی ایجاد کرنے والی نہیں ہیں تو بہشتی کیسے ایک لذت کو چھوڑ کر دوسری لذت سے استفادہ کرتے ہیں؟

مختصر جواب

ایسا لگتا ہے کہ اس سوال کا سرچشمہ، دنیا کی خصوصیات کا آخرت کے مسائل سے موازنہ کرنا اور دینوی خصوصیات کو معیار و مقیاس قرار دینا ہے نقصان، عیب، بیماری، موت، سستی اور کمی اس دنیا سے مخصوص ہیں، جبکہ آیات و روایات کے مطابق عالم آخرت کی خصوصیات اس دنیا کے مطابق نہیں ہیں

ایک لذت کو چھوڑ کر دوسری لذت سے استفادہ کرنا (ممکن ہے بہشت میں چھوڑنے کی معنی میں نہ ہو) نعمت سے تنگ آنے کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ نعمتوں کی تازگی اور تنوع کے لحاظ سے ہے بہشت تمام انبیاءؑ ائمہ اطہارؑ اور مومنین کا مطلوبہ کمال ہے بقول امیر المومنین علیہ السلام: بہشت کے بارے میں جو تعریف کی جائے گی، اگر اسے دل کی آنکھوں سے دیکھ لوگے تو دنیا میں جو بھی چیز آپ کو سب سے زیبا نظر آئے اسے چھوڑ دوگے

بہشتی انسان تلاش گر ہے، کیونکہ مسلسل اور گونا گوں تجلیات میں قرار پاتا ہے

جسمانی تجلیات سے رضوان الٰہی کی طرف عروج کرتا ہے اور ربوبیت حق کی فضا میں خلقت کا نظارہ کرتا ہے

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ایک بہشتی انسان کے لئے لذت کی بنیاد، یہ ہے کہ وہ اس وقت اپنے پروردگار کا مہمان بنا ہے اور اس کے دسترخوان پر بیٹھا ہے، یعنی اس حقیقت کے ساتھ ملحق ہو چکا ہے اور اس لحاظ سے اس کے لئے افسردگی اور تنگ آنا کوئی معنی نہیں رکھتا ہے

تفصیلی جواب

ایسا لگتا ہے کہ اس سوال کا سر چشمہ دینوی خصوصیات اور اخروی مسائل کے درمیان ایک قسم کا موازنہ کرنا اور دنیوی خصوصیات کو معیار و مقیاس قرار دنیا ہے جبکہ آیات و روایات کے مطالق آخرت کی خصوصیت اس دنیا کے مطابق نہیں ہیں بہشت میں عدم ونقصان کے ابعاد موجود نہیں ہیں، اس بنا پر، وہاں پر لذت دائمی ہے اور اس میں تغیر و تبدل، خرابی اور تشویش کی گنجائش نہیں ہے خداوند متعال کا ارشاد ہے: آخرت کا گھر ہمیشہ کی زندگی کا مرکز ہے [1] پس عالم آخرت اور اس کی تمام چیزیں زندہ و تازہ ہیں، بہشتی انسان تلاش گر ہے، کیونکہ وہ دائمی طور پر گوناگوں تجلیات میں قرار پاتا ہے، وہ جسمانی تجلیات سے رضوان الٰہی کی طرف عروج کرتا ہے اور ربوبیت حق کی فضا میں خلقت کا نظارہ کرتا ہے، اس بنا پر ایک لذت کو چھوڑ کر دوسری لذت سے استفادہ کرنا کسی نعمت سے تنگ آنے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ لذتوں کی تازگی، زندہ ہونے اور نعمت کے تنوع کی وجہ سے ہے

بہشت ایک بلند اور جاودانی مقام ہے، تمام انبیاءؑ، ائمہ اطہارؑ اور مومنین کا مطلوبہ کمال ہے اور دوسرے الفاظ میں تمام خدا پرستوں اور خدا کی تلاش کرنے والو کی آرزووں کی منزل ہے

حضرت علی علیہ السلام ایک خطبہ کے ضمن میں بہشت کے اوصاف کا ایک گوشہ یوں بیان

فرماتے ہیں:

جو کچھ بہشت کے بارے میں توصیف کی گئی ہے اگر اسے دل کی آنکھوں سے دیکھو گے تو جو کچھ دنیا سے مربوط ہے اسے چھوڑا دو گے، اگرچہ وہ دلکش اور زیبا ہو، نفسانی خواہشات اور اس سے مربوط خوشیاں ایسے امور ہیں جو انسان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں اگر چلتے ہوئے، بہشت کی نہروں کے کناروں پر موجود درختوں کے پتوں کی دلکش آواز اور درختوں کی ان جڑوں پر غور کرو گے تو اپنے آپ کو بھول جاؤ گے

اس طرح ان درختوں کی باطراوت ومحکم شاخوں پر تروتازہ مروارید کے خوشوں کا آویزان ہونا اور شاخوں پر رنگارنگ میوے، جو کسی محنت کے بغیر اتارے جاتے ہیں اور ہر کسی کے میل کے مطابق ان کے پہنچ میں ہوتے ہیں اہل بہشت کے لئے محل، پاک شہد اور تصفیہ شدہ شربتیں مہیا ہیں اہل بہشت وہ افراد ہیں کہ دائمی طور پر عنایت الٰہی ان کے شامل حال ہوتی ہے یہاں تک کہ اپنے ابدی گھر میں قرار پائیں اور یہاں سے وہاں جانے سے آزاد ہوجائیں پس اے سننے والے! جان لو کہ اگر اپنے دل کو ان زیبا مناظر تک پہنچنے میں مشغول کرو گے تو بہشت میں پہنچنے کے شوق میں شادمرگ ہوجاؤ گے اور اسی محفل سے قبرستان کی طرف چلے جاؤ گے اور دنیا کو خیر باد کرو گے [2]

ایک بہشتی کے لئے لذتوں کی بنیاد، وہ ہے کہ اس وقت اپنے خالق کا مہمان بنا ہے اور اس کے دسترخوان پر بیٹھا ہے، یعنی اس حقیقت سے ملحق ہوا ہے اور اس لحاظ سے اب اس کے لئے تنگ آنا اور تھک جانا کوئی معنی نہیں رکھتا ہے دنیا میں نکاح، لذیذ طعام کھانا اور گوارا شربتیں پینا، ان کی لذتیں اور ان کا اثر کم ہوتا ہے اور نابود ہوتی ہیں، یہ اس دنیا کے نقصان کی وجہ سے ہے اور اگر فرض کرو گے کہ یہاں پر نقائص کے ابعاد نہ ہوں تو خوشی ومسرت کبھی دل تنگی اور برائی میں تبدیل نہیں ہوں گی، اور ہر لذت وعیش جو پیدا ہوگی کسی کمی کے بغیر وہی

ابدی ہوگی

گویا قرآن مجید ایک جگہ پر اس نکتہ کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے ان کی منزل کے لئے جنت الفردوس ہے، وہ ہمیشہ اس جنت میں رہیں گے اور اس کی تبدیلی کی خواہش بھی نہ کریں گے [3]

حواشی

[1] سورہ عنکبوت، 64.

[2] نہج البلاغہ، خ 165.

[3] اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿١٠٧﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿١٠٨﴾ کہف، 108.

کیونکہ خداوند متعال فیاض مطلق ہے، پس کیوں انسان پہلے سے ہی بہشت میں پیدا نہیں کئے گئے ہیں؟

مختصر جواب

بہشت اور جہنم انسان کے اختیاری اعمال کا نتیجہ ہیں پس بہشت جو راہ کی آخری منزل ہے، دینا کے وجود اور اس میں نیک اعمال انجام دینے کے بغیر حاصل نہیں ہوتی ہے اور یہ خداوند متعال کے فیاض مطلق ہونے کے منافی نہیں ہے انسان کو خداوند متعال کی صفات میں سے صرف ایک صفت کی طرف توجہ کر کے باقی صفات سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے

تفصیلی جواب

انسانوں اور تمام مخلوقات کی تخلیق ایک خاص مقصد کے تحت انجام پائی ہے

پروردگار عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: خلق اللہ السموات والارض بالحق[1] اللہ نے آسمان اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے پس آسمانوں اور زمین کی تخلیق خداوند متعال کی ذات حق سے منسوب ہے، ایک بیہودہ اور فضول کام نہیں ہے

خداوند متعال قرآن مجید میں انسان کی خلقت کے مقصد کو صریح طور پر عبادت معرفی کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: اور میں نے جنات اور انسان کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے (تا کہ اس راہ سے کمال حاصل کر کے میرے نزدیک آئیں)[2]

عبادت کے معنی:

عربی زبان میں، جب کوئی چیز رام، نرم مطیع ہوجاتی ہے، اس طرح کہ اس میں کسی قسم کا عصیان اور نافرمانی نہ پائی جاتی ہو، تو اس حالت کو تعبد کہتے ہیں اس لئے ہموار راستہ کو طریق معبد کہا جاتا ہے [3] اور عابد انسان، اس کو کہتے ہیں جو خداوند متعال کا تسلیم و مطیع ہوتا ہے اور کسی قسم کی نافرمانی و عصیان نہیں کرتا ہے

عبادت اور تسلیم ہونا اس صورت میں معنی رکھتا ہے کہ انسان کے لئے نافرمانی اور بغاوت کی کوئی گنجائش نہ ہو یعنی انسان نافرمانی اور اطاعت میں سے ایک کا انتخاب کرے دوسرے الفاظ میں، دوسری مخلوقات کی بہ نسبت انسان کا امتیاز، ارادہ اور انتخاب کرنے کا اختیار ہے اور خداوند متعال نے انسان کے اندر متعدد اور مختلف توانائیاں قرار دی ہیں اور انسان کے کمال کی راہ انہی مختلف توانائیوں میں سے گذرتی ہے

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: خداوند متعال نے فرشتوں کو شہوت کے بغیر عقل دی ہے چوپاؤں کو عقل کے بغیر شہوت دی ہے، اور انسان کو دونوں چیزیں عطا کی ہیں، جو انسان شہوت پر عقل کا غلبہ حاصل کرے، وہ فرشتوں سے بہتر ہے اور جس کی عقل پر شہوت غلبہ کرے وہ چوپاؤں سے بدتر ہے [4]

اور ایک نکتہ یہ ہے کہ بہشت و جہنم انسان کے اختیاری اعمال کا نتیجہ ہے قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: پیغمبر: آپ ان سے پوچھئے کہ یہ عذاب زیادہ بہتر ہے یا وہ ہمیشگی کی جنت جس کا صاحبان تقوی سے وعدہ کیا گیا ہے اور وہی ان کی جزا بھی ہے اور ان کا ٹھکانا بھی [5] مزید ارشاد ہے: اور انہیں ان کے صبر کے عوض جنت اور حریر جنت عطا کرے گا [6] پس بہشت، جو راہ کی آخری منزل ہے، دنیا اور اس میں عمل صالح انجام دینے کے بغیر حاصل نہیں

ہوتی ہے

اور یہ خداوند متعال کے فیض مطلق کے منافی نہیں ہے، چونکہ خداوند متعال کا فیض حکمت الٰہی کی بنیاد پر جاری ہوتا ہے نہ یہ کہ خدا کی حکمت کے منافی ہو، انسان کو صفات الٰہی، میں سے صرف ایک صفت پر توجہ کر کے دوسری صفات سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے

حواشی

[1] سورہ عنکبوت، 44.

[2] وَ ماخَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْ اِنْسَ اِلاَّ لِیَعْبُدُ ونِ.سورہ ذاریات، 56.

[3] مفردات راغب.

[4] 4 آسمان و جہان، ترجمہ کتاب السماء و العالم بحارالانوار، ج 4، ص 273 . الْعِلَلُ، عَنْ أَبِيهِ عَنْ سَعْدِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ أَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عِيسَى عَنْ عَلِيِّ بْنِ الْحَكَمِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ سِنَانٍ قَالَ سَأَلْتُ أَبَا عَبْدِ اللَّهِ جَعْفَرَ بْنَ مُحَمَّدٍ الصَّادِقَ عليه السلام فَقُلْتُ الْمَلَائِكَةُ أَفْضَلُ أَمْ بَنُو آدَمَ فَقَالَ قَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ عليه السلام إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَ جَلَّ رَكَّبَ فِي الْمَلَائِكَةِ عَقْلًا بِلَا شَهْوَةٍ وَ رَكَّبَ فِي الْبَهَائِمِ شَهْوَةً بِلَا عَقْلٍ وَ رَكَّبَ فِي بَنِي آدَمَ كِلْتَيْهِمَا فَمَنْ غَلَبَ عَقْلُهُ شَهْوَتَهُ فَهُوَ خَيْرٌ مِنَ الْمَلَائِكَةِ وَ مَنْ غَلَبَ شَهْوَتُهُ عَقْلَهُ فَهُوَ شَرٌّ مِنَ الْبَهَائِمِ

[5] قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا ﴿۱۵﴾ .سورہ فرقان، 15.

[6] وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ﴿۱۲﴾.سورہ انسان، 12.

کیا کلیسا میں جا کر وہاں پر نماز پڑھی جا سکتی ہے یا وہاں پر خداوند متعال سے راز و نیاز اور مناجات کی جا سکتی ہیں؟

جب عیسائی دوست آپ کو دعوت کرتے ہیں، کہ ان کے ساتھ کلیسا جائیں، تو کیا کلیسا جا کر وہاں پر نماز پڑھی جا سکتی ہے یا خدا سے راز و نیاز اور مناجات کی جا سکتی ہیں؟ میں نے اسلامی کتابوں میں پڑھا ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ کے دوست ان کو دعوت کرتے تھے، وہ کلیسا میں جاتے تھے اور وہاں پر نماز پڑھتے تھے اور دعا کرتے تھے۔

مختصر جواب

صرف کلیسا میں داخل ہونا کوئی حرج نہیں ہے، مگر یہ کہ وہاں پر جانے والا مسلمان ایک ایسی شخصیت ہو کہ اس کے کلیسا میں داخل ہونا کلیسا کو رونق بخشنے کا سبب بنے، یا وہاں پر جانے والا مسلمان، معلومات اور متاثر ہونے کے لحاظ سے ایسا ہو کہ اس کا کلیسا میں جانا، اس کے اعتقاد میں سستی ایجاد ہونے کا سبب بنے اور اس کے عقیدہ و فکر میں گمراہی پیدا ہونے کا امکان ہو تو ایسے مواقع پر حکم ثانوی کے تحت عقل حکم کرتی ہے کہ مسلمان کو ایسا کام انجام نہیں دینا چاہئے کہ جس سے مسجد کی رونق کم ہو جائے اور کلیسا کی رونق بڑھنے کا سبب بنے اس کے

علاوہ مسلمان کو ہر قسم کے ممکنہ ضرر و خطر سے پرہیز کرنے کے طور پر ان جگھوں پر رفت و آمد سے اجتناب کرنا چاہیئے جیسے ایسے ریسٹورنٹوں میں جانے سے پرہیز کرنا چاہیئے، جہاں پر ممکن ہو کہ کھانے کی چیزیں حفظان صحت کے لحاظ سے مناسب نہ ہوں بلکہ آلودہ ہوں

پس:

1 اگر کلیسا متردک ہو اور مسیحی مبلغوں کے کنٹرول میں نہ ہو اور اس سے عیسائی استفادہ نہ کرتے ہوں (تاکہ آپ کے اعتقادات کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو) تو آپ اس جگہ سے، نماز اور دعا کی جگہ کے طور پر استفادہ کر سکتے ہیں، لیکن اس شرط پر کہ وہاں پر کوئی نجاست نہ ہو جو نماز پڑھنے والے کی سجدہ کی جگہ، بدن اور لباس پر سرایت کرے البتہ مستحب ہے پہلے سجدہ کی جگہ پر پانی ڈال کر اسے خشک ہونے دیں، پھر نماز پڑھیں [1]

2 مسلمانوں کی عبادت کی جگہ مسجد ہے، مسلمانوں کے لئے جائز نہیں ہے کہ دوسرے دیان کی عبادت گاہوں میں جانے کے رجحان کی وجہ سے مسجد کو خلوت کریں

3 کلیسا میں رفت و آمد کرنا اور یہود و عیسائیوں کی مذہبی تبلیغات سے رابطہ قائم کرنا صرف ان لوگوں کے لئے جائز ہے جو مذہبی معلومات کے لحاظ سے بلند مقامات پر ہوں اور اسلامی عقائد کا راسخ عقیدہ رکھتے ہوں، تاکہ غیر مسلموں کے عقائد سے متاثر نہ ہو جائیں

4 عیسائیوں کا دین حضرت سلیمانؑ کے سالہا سال بعد پیدا ہوا ہے اس لحاظ سے کیا یہ ممکن ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے کلیسا میں نماز پڑھی ہو؟

حواشی

[1] اللمعة الدمشقية، كتاب الصلوة، مكان المصلي.

قرآن مجید میں بیان ہوئے سات آسمانوں کے کیا معنی ہیں؟

مختصر جواب

آسمانوں اور کہکشانوں کے بارے میں سائنسی لحاظ سے پائے جانے والے ابہامات کے پیش نظر، قرآن مجید میں بیان کئے گئے سات آسمانوں کے بارے میں قطعی طور پر کوئی نظریہ پیش نہیں کیا جاسکتا ہے، بلکہ اس سلسلہ میں احتمال وگمان کی صورت میں چند نظریہ پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن اس نکتہ سے غافل نہیں رہنا چاہئے کہ قرآن مجید کا مقصد انسان کی معنوی تربیت و ہدایت ہے اور قرآن مجید کا سات آسمانوں وزمین، سورج اور زمین کی حرکت وغیرہ کے بارے میں اشارہ ان کی حقیقت کے علاوہ خداوند متعال کی لافانی قدرت کی نشاندہی اور خدا کو پہچاننے کی راہ کو ہموار کرنا اور خلقت کے بارے میں تفکر وتدبر کرنے کے لئے زمینہ آمادہ کرنا ہے اس کے علاوہ قرآن مجید کے بعض علمی مطالب کے لئے زمانہ اور تجربی علم میں ثابت ہونے کی ضرورت ہے اور اگر سائنس نے قرآن مجید کے علمی مسائل میں کوئی نظریہ پیش نہ کیا تو وہ قرآن مجید کے نظریہ کے باطل ہونے کی دلیل نہیں ہے

تفصیلی جواب

سات آسمانوں کے مقصود کو واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ذیل میں چند

نکات بیان کریں:

پہلا نکتہ: آسمان و زمین کی تعداد:

قرآن مجید میں، سات جگہوں پر واضح[1] طور پر دو جگہوں پر کنایہ [2] کی صورت میں سات آسمانوں کی بات کی گئی ہے اور ایک جگہ پر بظاہر سات زمینوں کا ذکر کیا گیا ہے[3]

دوسرا نکتہ: لغت میں سماء (آسمان) کا مقصد:

لغت میں سماء، سمو کے مادہ سے بلندی کے معنی میں ہے،[4] حتی بعض اہل لغت نے دعویٰ کیا ہے کہ ہر بلندی نچلے حصہ کی بہ نسبت آسمان ہے اور ہر نچلا حصہ اس کی بلندی کی بہ نسبت زمین ہے[5]

تیسرا نکتہ: قرآن مجید میں آسمان:

قرآن مجید میں لفظ سماء (آسمان) اور اس کے مشتقات تین سو دس بار آئے ہیں اور دو معنی میں استعمال ہوئے ہیں:

الف۔مادی آسمان:

قرآن مجید نے بہت سی جگہوں پر لفظ سماء (آسمان) اس کے مادی معنی میں استعمال کیا ہے کہ ان کے متعدد مصداق و معانی ارادہ ہوتے ہیں، من جملہ:

1 آسمان اوپر کی جہت کے معنی میں ،اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ [6] کیا تم نے نہیں دیکھا

کہ اللہ نے کس طرح کلمہ طیبہ کی مثال شجرہ طیبہ سے بیان کی ہے جس کی اصل ثابت اور اس کی شاخ آسمان تک پہنچی ہوئی ہے

2 آسمان، زمین کے اطراف کی فضا کے معنی میں: **وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا** [7] اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا ہے

3 آسمان، سیاروں اور ستاروں کی جگہ کے معنی ہیں: بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں چراغ اور چمکتا ہوا چاند قرار دیا ہے [8]

(ب)۔معنوی معنی میں آسمان:

قرآن مجید میں بہت جگہوں پر لفظ سماء (آسمان) کو اس کے معنوی معنی میں استعمال کیا گیا ہے، ان سے بھی متعدد مصداق اور معانی ارادہ ہوتے ہیں من جملہ:

1 آسمان، مقام قرب اور مقام حضور کے معنی میں کہ جو عالم کے امور کی تدبیر کی جگہ ہے: وہ خدا آسمان سے زمین تک کے امور کی تدبیر کرتا ہے [9]

2 آسمان ایک عالی اور حقیقی [10] موجود کے معنی میں: اور آسمان میں تمہارا رزق ہے اور جن باتوں کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے [11]

چوتھا نکتہ: سبع (سات) کا مراد کیا ہے؟

لفظ سبع (سات) عربی میں دو صورتوں میں استعمال ہوا ہے:

الف سات، ایک مشخص و معین عدد کے معنی ہیں جو ریاضیات میں استعمال ہوتا ہے

ب کثرت کی علامت کے معنی میں، کیونکہ بعض اوقات عربی میں سات کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور اس کے کنایہ کے معنی (زیادہ تعداد اور کثرت) مراد ہوتے ہیں

پانچواں نکتہ: سات آسمان کے لفظ سے قرآن مجید کا مقصد

مفسرین نے لفظ سات آسمان کے بارے میں کئی احتمال بیان کئے ہیں:

الف اگر سات، حقیقی عدد کے معنی میں ہو تو اس صورت میں مندرجہ ذیل احتمالات قابل تصور ہیں:

1 ستاروں اور سیاروں سے بھرے سات آسمان جن میں سے ہر ایک کرہ زمین کے آسمان کے مانند ہے [12] سات مشابہ دنیا کے وجود کا احتمال ہے جو ابھی کشف نہیں ہوئے ہیں

2 فطرت کے سات پست مراتب وجودی کے مقابل میں قرب وحضور کے سات عالی ومعنوی مقام (سات آسمان[13])

اب اگر سات، کثرت کے معنی میں ہو تو اس صورت میں مندرجہ ذیل احتمالات قابل تصور ہیں:

1 بہت سے آسمان (کثرت و سیارات وغیرہ کا مجموعہ) پیدا کئے ہیں اور بہت سی زمینیں (زمین کے مانند خاکی کرات) پیدا کئے ہیں کہ یہ سب فضا میں تیرتے اور معلق ہیں

2 آسمان کے بہت سے فضاؤں کو پیدا کیا ہے اور زمین کے اندر بہت سے طبقات یا زمین کے ٹکڑوں اور ممالک کو پیدا کیا ہے

3 بہت سے عالی مخلوقات معنوی مراتب و مقامات قرب وحضور پیدا کئے ہیں نتیجہ یہ کہ، ہماری عدم معرفت اور کافی اطلاعات نہ رکھنے کے پیش نظر اور آسمانوں اور کہکشانوں کے بارے میں سائنسی نظریات کے مطابق پائے جانے والے شبہات کے پیش نظر ہم قرآن مجید میں بیان کئے گئے سات آسمانوں کے معنی کے بارے میں کوئی قطعی نظریہ پیش نہیں کرسکتے

ہیں اور اس سلسلہ میں تمام نظریات احتمال اور گمان کی صورت میں پیش کئے جاتے ہیں [14] لیکن اس نکتہ کو نہیں بھولنا چاہئے کہ قرآن مجید کا مقصد انسان کی معنوی تربیت اور ہدایت کرنا ہے اور قرآن مجید کا سات آسمانوں اور زمین، سورج اور زمین کی حرکت وغیرہ کے بارے میں اشارہ ان کی حقیقت کے علاوہ خداوند متعال کی لافانی قدرت کی نشاندہی اور خدا کو پہچاننے کی راہ کو ہموار کرنا اور خلقت کے بارے میں تفکر و تدبر کرنے کے لئے زمینہ آمادہ کرنا ہے اس کے علاوہ قرآن مجید کے بعض علمی مطالب کے لئے زمانہ اور تجربی علوم میں ثابت ہونے کی ضرورت ہے اور اگر سائنس نے قرآن مجید کے علمی مسائل میں کوئی نظریہ پیش نہ کیا تو وہ قرآن مجید کے نظریہ کے باطل ہونے کی دلیل نہیں ہے مزید مطالعہ کے لئے مندرجہ ذیل کتابوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے:

1 پژوہش در اعجاز علمی قرآن، تالیف: محمد علی رضائی اصفہانی ج، 1 ص 134

2 معارف قرآن تالیف محمد تقی مصباح یزدی، ص 234

3 تفسیر نمونہ، ناصر مکارم شیرازی ج 1، ص 165 [15]

حواشی

[1] بقرہ، 29: اسراء: مومنون، 86: فصلت، 12

[2] ملک، 3: نوح، 15

[3] طلاق، 12 اَللّٰهُ الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الۡاَرۡضِ مِثۡلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الۡاَمۡرُ بَیۡنَهُنَّ

(3) اللہ وہی ہے جس نے ساتوں آسمان کو پیدا کیا ہے اور زمینوں میں بھی ویسی ہی زمینیں بنائی ہیں

[4] التحقیق می کلمات القران الکریم، حسن مصطفوی، (انتشارات وزارت فرھنگ و ارشاد اسلامی، ج 1، تھران، 1371 ش) ج 5، ص 254

[5] مفردات، راغب اصفہانی، المکتبہ الرضویہ، تھران، 1332 ش، مادہ سماء

[6] ابراہیمؑ، 24

[7] ق،9

[8] تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿٦١﴾ (سورہ فرقان، 61)

[9] يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (سورہ سجدہ، 5)

[10] ملاحظہ ہو: معارف قرآن، استاد مصباح یزدی، (انتشارات در راہ حق، قن، 1367 ش)، ص 234: و ملاحظہ ہو پژوہش در اعجاز علمی قرآن دکتر محمد علی رضائی اصفہانی، انتشارات مبین، رشت، ج 1، 1380، ج1، ص134

[11] وفی السماء رزقکم و ماتوعدون (ذاریات، 22)

[12] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم ایضاً، ج1، ص165، مفردات راغب، مادہ ارض

[13] ملاحظہ ہو: المیز ان، علامہ طباطبایی، نشر اسراء قم، ج16، ص247 و ج19، ص327

[14] ملاحظہ ہو: تفسیر الجوہر، طنطاوی جوہری، دار الفکر، بی تا، ج 1، ص 46: ملاحظہ ہو: بزوہش در اعجاز قرآن، دکتر محمد علی رضائی اصفاھانی، ہمان، ج1، ص126 132

[15] ملاحظہ ہو: سایٹ پایگاہ مرکز فرھنگ و معارف قرآن

کیا فرشتوں میں عصمت کا کوئی درجہ پایا جاتا ہے؟

مختصر جواب

ملائکہ اور فرشتے انتہائی شریف اور لطیف مخلوق ہیں اور ان میں بہت سے نیک خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید کی آیات میں ذکر کیا گیا ہے من جملہ اس کے کہ ان میں خاکی اور حیوانی خصوصیات کا پایا جانا ممکن نہیں ہے اور وہ بنیادی طور پر گناہ انجام دینے کے سلسلہ میں کسی قسم کا رجحان اور طاقت نہیں رکھتے ہیں اور اسی لئے وہ ہر قسم کے گناہ و معصیت سے پاک و منزہ ہیں۔

اس بنا پر اگر معصوم ہونا صرف عدم ارتکاب گناہ و معصیت کے معنی میں ہو، تو کہا جاسکتا ہے کہ فرشتے بھی معصوم ہیں، کیونکہ وہ ہر قسم کے گناہ اور معصیت سے پاک و منزہ ہیں اگر عصمت، نفسانی ملکہ رکھنے اور تقوائے الٰہی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی حالت کے معنی میں ہو جو خداوند متعال کی مدد سے انبیاء اور ائمہ اطہار علیہم السلام میں پیدا ہوتی ہے، کہ وہ انسانی خصوصیات اور شہوت، غضب اور گناہ انجام دینے کی طاقت رکھنے کے باوجود اپنے اختیار سے گناہ سے چشم پوشی کرتے ہیں اور کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے ہیں تو وہ اس معنی میں معصوم نہیں ہیں۔

تفصیلی جواب

ملائکہ اور فرشتے انتہائی شریف اور لطیف مخلوق ہیں جو ہر قسم کے گناہ معصیت سے

پاک ومنزہ ہوتے ہیں قرآن مجید نے ان کا کافی احترام کیا ہے، یہاں تک کہ ملائکہ کا ایمان خدا انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابوں پر ایمان کی فہرست میں قرار پایا ہے [1]

قرآن مجید ان کی خصوصیات کو یوں بیان کرتا ہے:

1. فرشتے، عاقل و باشعور مخلوقات اور خداوند متعال کے محترم بندے ہیں [2]

2. وہ خداوند متعال کے فرمان بردار ہیں اور ہرگز معصیت نہیں کرتے ہیں [3]

3. وہ مسلسل خداوند متعال کی تسبیح و تقدیس میں مشغول ہیں: فرشتے اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بجالاتے ہیں اور زمین کے باشندوں کے لئے، استغفار کرتے ہیں [4]

4. فرشتے بلا استثنا، حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے لئے سجدے میں گرے اور حضرت آدم علیہ السلام ان کے معلم بن گئے [5] یہ اس بات کی حکایت ہے کہ انسان اپنی مکمل استعداد کے مطابق، ان سے برتر ہے

5. وہ نہ کھانا کھاتے ہیں، نہ پانی پیتے ہیں اور نہ ازدواج کرتے ہیں، چنانچہ ہم حضرت امام صادق علیہ السلام سے نقل کی گئی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: فرشتے غذا نہیں کھاتے ہیں اور پانی نہیں پیتے ہیں اور ازدواج نہیں کرتے ہیں، بلکہ عرش الٰہی کی نسیم سے زندہ ہیں [6]

6. وہ نہ سوتے ہیں اور نہ ان میں سستی آتی ہے اور نہ غفلت، چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے ایک حدیث میں یوں فرمایا: ان میں نہ سستی ہے، نہ غفلت اور نہ معصیت ان پر نیند طاری نہیں ہوتی ہے اور ان کی عقل سہو ونسیاں سے دوچار نہیں ہوتی ہے، ان کے بدن میں سستی پیدا نہیں ہوتی ہے اور وہ اپنے باپ کے صلب اور ماں کے رحم میں قرار نہیں پاتے ہیں [7]

7. ان کے مختلف مقام اور متفاوت مراتب ہیں، ان میں سے بعض ہمیشہ رکوع میں

ہیں اور بعض ہمیشہ سجدہ میں

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اور ہم میں سے ہر ایک کے لئے ایک مقام معین ہے اور ہم اس کی بارگاہ میں صف بستہ کھڑے ہونے والے ہیں اور ہم اس کی تسبیح کرنے والے ہیں [8][9] لیکن کیا یہ شریف اور لطیف مخلوقات معصوم بھی ہیں یا نہیں؟ اس سوال کے جواب کے لئے ضروری ہے کہ پہلے عصمت کی تعریف کی جائے لغت میں عصمت کے معنی روکنا اور رکاوٹ بننا ہے اور اصطلاح میں اس نفسانی حالت اور ملکہ کو کہتے ہیں جو انسان کو گناہ، حتی خطا اور اشتباہ سے روکے [10]

اس بنا پر، عصمت کا مقام ایک نفسانی ملکہ اور تقوائے الٰہی کی حالت ہے، جو خداوند متعال کی مدد سے انبیاء اور ائمہ علیہم السلام میں پیدا ہوتی ہے البتہ یہ حالت اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ گناہ انجام نہ دے سکیں، بلکہ یہ نفسانی حالت رکھنے والے اس کے باوجود کہ گناہ تک ان کی پہنچ ہوتی ہے اور اس کے مرتکب ہونے کی طاقت بھی رکھتے ہیں، لیکن اپنے ارادہ و اختیار سے گناہ سے چشم پوشی کرتے ہیں اور ہرگز کسی معصیت کے مرتکب نہیں ہوتے ہیں

ان کی مثال بالکل اس بہت آگاہ طبیب کے مانند ہے کہ ایک خطرناک زہریلے مادہ کے خطرات سے آگاہ ہونے کے سبب ہرگز اسے نہیں کھاتا ہے، باوجودیکہ اس کو کھانے کی طاقت رکھتا ہے، اس کی آگاہی اور اس کی فکری و روحی بنیادیں سبب بن جاتی ہیں کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے اس کام کو انجام دینے سے برہیز کرے

قابل توجہ بات ہے کہ عصمت ایک خاص عطیہ الٰہی ہے، جسے خداوند متعال نے رہبری اور قیادت کی بھاری مسئولیت کے سبب اپنے انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کو عطا کیا ہے اس بنا پر، عصمت ایک ایسا امتیاز ہے جس اکا فائدہ عوام اناس کو پہنچتا ہے [11]

عصمت کے معنی اور حقیقت کے پیش نظر قابل ذکر ہے کہ: اگرچہ فرشتے ہر قسم کے

گناہ و معصیت سے پاک و منزہ ہیں، لیکن وہ اس عصمت کے مالک نہیں ہیں، جو انبیاء اور ائمہ علیہم السلام میں پائی جاتی ہے

البتہ اگر عصمت کے معنی کو وسعت بخشی جائے اور اسے ہر وجہ سے عدم ارتکاب گناہ کے معنی میں لیا جائے تو اس صورت میں فرشتے بھی معصوم ہیں کیونکہ ان میں گناہ کو انجام دینے کے بارے میں کسی قسم کا رجحان اور کشش نہیں پائی جاتی ہے اور وہ ہمیشہ اپنے پروردگار کی تسبیح و تقدیس میں مشغول اور اس کے حکم کے تابع ہوتے ہیں

البتہ ملائکہ ایک ہی سطح اور ایک ہی درجہ پر نہیں ہیں، بلکہ ان کے مختلف درجے ہیں قرآن مجید اس سلسلہ میں ارشاد فرماتا ہے: اور ہم میں سے ہر ایک کے لئے ایک مقام معین ہے [12]

ان میں سے بعض ملائکہ، جیسے جبرئیل، مکائیل، اسرافیل اور عزرائیل درگاہ الٰہی کے مقرب ملائکہ ہیں اور ان کے درجات بہت بلند ہیں کہ فلاسفہ نے انہیں رؤس الملائکہ کا خطاب دیا ہے، اور بعض دوسروں کے درجات اور فرائض کو یوں بیان کیا گیا ہے: ان میں سے بعض پروردگار کی طرف سے پیغمبروںؑ کو وحی پہنچانے کے امین ہیں اور بعض خدا کے بندوں کے محافظ اور بعض بہشت کے دربان ہیں [13]

لیکن جو روایتیں، بعض ملائکہ کی طرف سے خداوند متعال کے حکم کی نافرمانی کرنے اور ان کی تنبیہ اور سزا کے بارے میں نقل ہوئی ہیں، جیسے فطرس کے بارے میں، یہ مصدقہ نہیں ہیں اور تمام علمائے اسلام نے ایسی روایتوں کو قبول نہیں کیا ہے ان میں سے بعض کا اعتقاد ہے کہ: فطرس کے قضیہ کو ثابت کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ فطرس ایک یونانی لفظ ہے اور تیسری شعبان کی دعا میں بھی اسے فرشتہ نہیں کہا گیا ہے بلکہ اس صورت میں آیا ہے: وعاذ فطرس بمہدہ یعنی فطرس نے امام حسین (علیہ السلام) کے گہوارے میں پناہ لے لی دوسری

جانب سے اس دعا کی سند بھی قابل تحقیق ہے اور اس کا اعتبار معلوم ہونا چاہئے [14]

بعض افراد فرشتوں کی معصیت اور ان کو تنبیہ کی جانے کے منکر ہیں اور کہتے ہیں: فطرس کے معصیت کی روایت، آیہ شریفہ: بَلۡ عِبَادٌ مُّكۡرَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾ [15] اور آیہ: وہ فرمان الٰہی کی نافرمانی نہیں کرتے ہیں اور جو حکم ہوتا ہے اسے انجام دیتے ہیں [16] سے تضاد رکھتی ہے اس بنا پر اس گروہ کے نظریہ کے مطابق فرشتوں کی معصیت قابل قبول نہیں ہے

دوسری جانب سے شیعہ علماء نے اس قسم کی روایت کے صحیح ہونے کے فرض پر چند احتمالات پیش کئے ہیں:

1 بعض مفسرین نے کہا ہے: ملائکہ کی سزا اور تنبیہ ترک اولٰی کی وجہ سے تھی نہ گناہ و معصیت کی وجہ سے ترک اولٰی سے مراد، یہ ہے کہ انہوں نے فرمان الٰہی کو نافذ کرنے میں اس عمل کو چھوڑا ہے جو زیادہ اولویت کا حامل تھا اور وہ عمل انجام دیا ہے جو کم تر اولویت کا حامل تھا، یا عمل کو جس زمانہ میں انجام دینا اولویت کا حامل تھا، انجام نہیں دیا ہے اور دوسرے حالات اور وقت میں انجام دیا ہے کہ اولویت نہیں رکھتا تھا، اس لئے انہیں سزا اور تنبیہ کا سامنا کرنا پڑا ہے [17]

2 بعض لوگوں نے فرشتوں کے عصیان اور تنبیہ کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے، احتمال دیا ہے کہ اس قسم کی روایتیں ان ملائکہ سے مربوط ہیں جو انسان کی شکل میں ہیں اس سلسلہ میں شہید مطہری فرماتے ہیں: احادیث اور روایتوں میں بعض ملائکہ کو زمینی ملائکہ کہا گیا ہے، وہ نامرئی مخلوقات ہیں، لیکن شائد انسان کے شبیہ ہیں، یعنی تکلیف قبول کرتے ہیں اور نافرمانی کرتے ہیں ان کی حقیقت ہمارے لئے واضح نہیں ہے حتی بعض رویتوں میں آیا ہے کہ بعض ملائکہ اس دنیا کے عناصر سے خلق کئے گئے ہیں [18]

3 بعض کا اعتقاد ہے کہ فطرس کی روایت کی سند اور اس کا فرشتہ ہونا ثابت ہونے کی

صورت میں یہ امر آیہ شریفہ لایعصون اللہ [19] کے منافی نہیں ہے، کیونکہ فرشتے یکساں نہیں ہیں عرش کو حمل کرنے والے فرشتے، اور وحی کو حمل کرنے والے فرشتے، بلند مقام والے فرشتے ہیں: وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ [20] وحی کو حمل کرنے والے فرشتے معصوم ہیں اور ان میں کمال نہیں ہے ہمارے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ تمام فرشتے ایک قسم کے ہوں اور کوئی فرشتہ انسان کے مانند کمال والا نفس نہ رکھتا ہو! پس ممکن ہے فطرس زمینی فرشتوں میں سے ہو اور آسمانی و اخروی فرشتوں سے فرق رکھتا ہو [21]

جو کچھ حضرت علی علیہ السلام نے فرشتوں کی خصوصیات کے بارے میں توصیف میں بیان فرمایا ہے، اس کے پیش نظر اگر اس کلام کو ہم فرشتہ کی توصیف قرار دیں تو حضرتؑ نے تمام فرشتوں کی توصیف بیان فرمائی ہے، اس صورت میں سب سے نچلے درجہ کے فرشتے بھی ان خصوصیات کے مالک ہونے چاہئے لہٰذا ان کے بارے میں معصیت کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے، مگر یہ کہ ترک اولیٰ اور تنزلی گناہ کی صورت میں [22] لیکن اگر ہم نے کہا کہ حضرت علی علیہ السلام نے ایک خاص قسم کے فرشتوں کی توصیف فرمائی ہے اور اس سلسلہ میں کچھ اور روایتیں بھی گواہ ہیں، تو ہمیں مذکورہ دو توجیہات میں سے ایک کو قبول کرنا چاہئے

بہرحال چونکہ فرشتے غیر مادی مخلوقات ہیں، اس لئے ان کی پہچان صرف آیات و روایات کے ذریعہ ہونا ممکن ہے اور ہر روایت سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ روایتیں سند اور دلالت کے لحاظ سے مکمل طور پر قابل اعتماد ہونی چاہئے، جب تک ہم اس قسم کی کوئی روایت نہ پائیں تب تک ہمارا مرجع صرف قرآن مجید کی آیات ہیں

حواشی

[1] سورہ بقرہ، 285، اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ: رسول ان تمام باتوں پر ایمان رکھتا ہے جو اس کی طرف نازل کی گئی ہیں

اور مومنین بھی سب اللہ اور ملائکہ اور مرسلین پر ایمان رکھتے ہیں

[2] سورہ انبیاء 26، بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

[3] سورہ انبیاء 27، لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾، سورہ تحریم، 6

[4] سورہ شوریٰ، 5، وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ط

[5] سورہ بقرہ، 30 34

[6] بحار انوار، ج 59، ص 174، ان الملائكة لا ياكلون ولا يشربون ولا ينكحون وانما يعيشون بنسيم العرش

[7] بحار انوار، ج 59، ص 175، ليس فيهم فترة ولا عندهم غفلة ولا فيهم معصية... لا يغشاهم نوم العيون ولا سهوا العقول ولا فترة الابدان لم يسكنو الاصلاب ولم تضمهم الارحام

[8] سورہ صافات 164 166، وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

[9] تفسیر نمونہ، ج 18، ص 174 176.

[10] مصباح یزدی، محمد تق، اصول عقاید، ج 2، ص 121.

[11] تفسیر نمونہ، ج 17، ص 304.

[12] سورہ صفات، 164.

[13] نہج البلاغہ فیض الاسلام، خطبہ 1.

[14] پرسش و پاسخ ہا در محضر آیت اللہ جوادی آملی، ج 2، ص 88.

[15] وقالوا اتخذ الرحمن ولداً سبحانہ بل عباد مکرمون، سورہ انبیاء 26.

اور لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا اللہ نے کسی کو بیٹا بنا لیا ہے، حالانکہ وہ اس امر (عیب ونقص) سے پاک و منزہ ہے بلکہ وہ (فرشتے) سب اس کے محترم بندے ہیں

[16] يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۶﴾ ایمان والو اپنے نفس

اور اپنے اہل کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے جس پر وہ ملائکہ معین ہوں گے جو سخت مزاج اور تند و تیز ہیں اور خدا کے حکم کی مخالفت نہیں کرتے ہیں اور جو حکم دیا جاتا ہے اسی پر عمل کرتے ہیں (سورہ تحریم۔6)

[17] آیت اللہ مکارم، در پرسش و پاسخھای حضوری.

[18] مرتضی مطہری، توحید، ص 342،

19] يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۝ سورہ تحریم، 6.

[20] سورہ صافات، 164.

[21] توصیہ ہا، پرسشہا و پاسخ ہا در محضر آیت اللہ جوادی آملی، ج 2، ص 8788.

[22] اس سلسلہ میں، جناب محمد احسانی فر کا فرشتہ فطرس کے بارے میں روایات پر تحقیقی مقالہ ملاحظہ ہو: مجلہ علوم حدیث شمارہ 34، صفحہ 68 تا 80 (سال نہم شمارہ چہارم 1383 ہ ش) وہ اس مقالہ میں فطرس کی روایت کی سند کو قابل اعتبار جانتے ہیں اور اسے گناہ منزلتی جانتے ہیں اور گناہ منزلتی عصمت سے منافات نہیں رکھتا ہے۔

حضرت سلیمانؑ اپنے بیٹے کی وفات کے بعد کیسے ملک و فرماں روائی کا تقاضا کرتے ہیں لیکن امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں: اے علیؑ! تیرے بعد اس دنیا پر حیف ہو!؟

روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے بیٹے کی وفات کے سلسلہ میں مصیبت آنے پر قرآن مجید کے مطابق یہ دعا کی: قال رب اغفرلی وھب لی ملکاً لاینبغی لاحد من بعدی انک انت الوہاب یعنی حضرت سلیمانؑ دنیا پر نا امیدی کی نظر ڈالے بغیر ملک و فرماں روائی کا تقاضا کرتے ہیں

لیکن کربلا کے حادثہ میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام صبر و شکیبائی کا نمونہ ہیں اور انبیاء حتی اولوالعزم پیغمبروں علیہم السلام کی بنسبت افضل ہونے کے باوجود اپنے بیٹے علی اکبرؑ کے جنازہ پر فرماتے ہیں: یا علی! علی الدنیا بعدک العفی یعنی اے علی! تیرے بعد اس دنیا پر حیف ہو!

اگر مذکورہ آیہ شریفہ میں قرآن مجید کے بیان کے مطابق حضرت سلیمانؑ کا قول و فعل ایک فضیلت ہے تو اس قول و فعل میں امام حسین علیہ السلام کے بارے میں تناقض کی کیسے توجیہ کی جاسکتی ہے؟ مہربانی کرکے مناسب عقلی و روائی استدلال کے ساتھ جواب دیجئے

مختصر جواب

اگرچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ بیان ان کی روحانی عظمت اور خداوند متعال کی لازوال رحمت پر ان کے یقین کے مقام کی حکایت کرتا ہے جو عام انسانوں کی بہ نسبت کافی بلند و برتر مقام ہے، لیکن امام حسین علیہ السلام کے خاص حالات کی بہ نسبت قابل موازنہ نہیں ہے چونکہ یہ آیات اولاً: ایک طرح سے اس بات کی حکایت کرتی ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک لمحہ کے لئے لغزش (البتہ ترک اولیٰ) سے دوچار ہوئے ہیں، اور فرزند کو کھو دینا ایک قسم کی سزا شمار ہوتی تھی

ثانیاً: جس فرزند سے حضرت سلیمان علیہ السلام محروم ہو چکے تھے وہ ناقص الخلقت تھا اور تولد کے دوران ہی فوت ہو چکا تھا، عام طور پر ایسے فرزند سے محروم ہونا انسان کے جذبات مجروح ہونے کا سبب نہیں بنتا ہے امام حسین علیہ السلام نے عاشور کے دن یہ بیان اس وقت زبان مبارک پر جاری فرمایا کہ اولاً: آپؑ اس وقت کمال ومعرفت اور خدا کے عشق کے عروج پر تھے

ثانیاً: خداوند متعال کی راہ میں ایک ایسے فرزند کو ہدیہ کے طور پر پیش کر چکے تھے جو جسمی، اخلاقی اور گفتار و کردار کے لحاظ سے شبیہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اس قسم کے فرزند کو کھو دینے پر اس دل خراش حالت میں گریہ وزاری کرنا ہر سنگ دل کے قلب کو بھی متاثر کر کے رکھ دیتا ہے کیونکہ، اولاً: یہ مکمل طور پر ایک فطری عمل ہے ثانیاً: امامؑ کے وجودی جامعیت کی حکایت ہے کہ آپؑ عین شجاعت اور مبارزہ و جہاد کی حالت میں جذبات اور محبت بھرے ایک دل کے مالک ہیں ثانیاً: یہ جملہ امام حسین علیہ السلام کی جاں نثاری کے کمال کی حکایت کرتا ہے کہ قیمتی ترین چیز کو خدا کی راہ میں پیش کرتے ہیں اس لئے، امام حسین علیہ السلام کا یہ بیان رحمت الٰہی سے نہ صرف یاس و ناامیدی نہیں ہے بلکہ برتر اور پائدار اخروی زندگی کے بارے میں امید و

ایمان سے بہرا ہے

تفصیلی جواب

سورہ ص کی آیت نمبر 34 اور 35 [1] کی شان نزول کے بارے میں تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں بہت سی حکایتیں اور روایتیں نقل کی گئی ہیں کہ ان میں مناسب اور معقول ترین روایت حسب ذیل ہے:[2]

حضرت سلیمان علیہ السلام کی تمنا تھی کہ خداوند متعال انہیں چند شجاع اور بہادر فرزند عطا کرے تا کہ وہ حکومت چلانے خاص کر دشمنوں سے جہاد کرنے میں ان کی مدد کریں ان کی کئی بیویاں تھیں انہوں نے اپنے آپ سے کہا: میں ان کے ساتھ مباشرت کروں گا، تا کہ مجھے کئی فرزند ملیں اور میرے مقصد میں میری مدد کریں گے لیکن چونکہ یہاں پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے غفلت کی اور انشاء اللہ نہ کہا یہ وہ جملہ ہے جو انسان کے لئے ہر حالت میں خدا پر بھروسہ کرنے کی علامت ہے، اس لئے ان کی بیویوں میں سے کسی ایک نے بھی کسی فرزند کو جنم نہیں دیا، صرف ایک ناقص الخلقت فرزند بے روح جسد کے مانند پیدا ہوا، اسے لاکر ان کی کرسی پر رکھ دیا گیا! حضرت سلیمان علیہ السلام انتہا کی فکر و پریشانی میں غرق ہو گئے، اور کافی بے چین ہو گئے، کیوں انہوں نے ایک لمحہ کے لئے خداوند متعال سے غفلت کی تھی اور اپنی طاقت پر بھروسہ کیا تھا، انہوں نے توبہ کی اور بارگاہ الٰہی میں پلٹ کر آ گئے [3]

یہ آیات اولاً ایک جہت سے اس بات کی حکایت کرتی ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ایک لمحہ کے لئے لغزش (البتہ ترک اولی) سے دوچار ہوئے ہیں فرزند سے محروم ہونا ایک قسم کی سزا شمار ہوتی تھی ثانیاً: جس فرزند سے محروم ہوئے تھے، وہ ناقص الخلقت تھا اور پیدائش کے وقت ہی فوت ہو چکا تھا، عام طور پر ایسے فرزند سے محروم ہونا انسان کے جذبات مجروح ہونے کا سبب نہیں بنتا ہے امام حسین علیہ السلام نے عاشور کے دن یہ بیان اس وقت زبان مبارک

پر جاری فرمایا کہ

اولاً آپ علیہ السلام کمال و معرفت اور خدا کے عشق کے عروج پر تھے،

ثانیاً: آپؑ کے فرزند جسمانی، اخلاقی اور گفتار کے لحاظ سے شبیہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے ایک ایسے فرزند تھے جو اپنے امام زمانہ پر قربان ہوئے اور میدان کا رزار کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے فرمایا: میں علیؑ بن حسینؑ بن علیؑ ہوں میں ایک ایسے گروہ سے تعلق رکھتا ہوں جن کا جد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں خدا کی قسم زنازادہ کا بیٹا ہمارے درمیان حکومت نہیں کرے گا میں تم پر اس نیزہ سے اس قدر وار کروں گا کہ اس کی نوک مڑ جائے میں تم پر تلوار سے وار کروں گا اور اپنے باپ کی حمایت کروں گا میں تم پر ایک ہاشمی اور علوی جوان کے مانند وار کرتا ہوں [4]

اس قسم کے فرزند کو کھو دینے پر اس دل خراش حالت میں گریہ وزاری کرنا ہر سنگ دل کے قلب کو بھی متاثر کر کے رکھ دیتا ہے، کیونکہ، اولاً: یہ مکمل طور پر ایک فطری عمل ہے، ثانیاً: امام کے وجودی جامعیت کی حکایت ہے کہ عین شجاعت، مبارزہ اور جہاد کی حالت میں ایک جذبات اور محبت بھرے دل کے مالک ہیں، کیونکہ آپؑ تمام انسان کمالات کے سرچشمہ ہیں اور مہر و محبت کمالات انسانی میں ایسے کمال ہے چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اپنے بیٹے حضرت ابراہیمؑ کی رحلت پر روئے ہیں اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رونے کی علت پوچھی گئ تو جواب میں فرمایا: یہ گریہ وزاری نہیں ہے، بلکہ رحمت ہے جو ترحم نہ کرے، اس پر کوئی رحم نہیں کرے گا [5]

فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا بھی اپنے والد محترم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر پر سوز و گداز کے عالم میں فریاد بلند کرتے ہوئے فرماتی تھیں: ابا جان! (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چلے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانے کے بعد دنیا نے دن کی روشنی کو ہم سے چھین لیا اپنی نعمتوں اور خوشیوں سے ہمیں

محروم کیا، دنیا آپ کے حسن و جمال سے منور تھی، لیکن اب دن کا اجالا رات کی تاریکی میں تبدیل ہو چکا ہے اور اس کا خشک و تر رات کی اندھیری کی خبر دیتا ہے [6]

ثالثاً حضرت امام حسین علیہ السلام کا اپنے مجروح و بے روح بیٹے کے جسم پر یہ جملہ: یا علی ! علی الدنیا بعدک العفی، یعنی اے علی تیرے بعد اس دنیا پر حیف ہو! امام کی نظروں میں حضرت علی اکبرؑ کے مقام و منزلت کی نشانی ہے علی اکبر کا وجود امام کے لئے آپؑ کی زندگی کے برابر تھا

رابعاً: یہ جملہ امام حسین علیہ السلام کی جاں نثاری کے کمال کی حکایت کرتا ہے کہ قیمیتی ترین چیز کو خدا کی راہ میں پیش کرتے ہیں

اس کے علاوہ، جو شخص اپنی اور اپنے فرزندوں کی مکمل صحت و سلامتی کی حالت میں خدا کی خوشنودی کے لئے سب کچھ اس کی راہ میں لٹا دے، کیا وہ خدا کی رحمت کا زیادہ امیدوار ہے یا وہ شخص جس نے اپنے ایک ناقص الخلقت فرزند کو کھو دیا ہے اور اس حالت میں خداوند متعال سے دنیا کی سلطنت کا مطالبہ کرتا ہے؟ اگر چہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ بیان بھی ان کی روحانی عظمت اور خداوند متعال کی لا زوال رحمت پر ان کے یقین کے مقام کی حکایت کرتا ہے، جو عام انسانوں کی بہ نسبت کافی بلند و برتر مقام ہے، لیکن امام حسین علیہ السلام کے خاص حالات کی بہ نسبت قابل موازنہ نہیں ہے۔

اس بنا پر امامؑ کا یہ بیان نہ صرف رحمت الٰہی سے یاس و ناامیدی کی حکایت نہیں کرتا ہے بلکہ اخروی اور برتر زندگی کی بہ نسبت ان کی بلند امید و ایمان کی حکایت کرتا ہے اس کے علاوہ امام حسین علیہ السلام کا یہ جملہ اس زمانہ کے نامناسب حالات کی حکایت کرتا ہے امام حسین علیہ السلام کی ایک دوسری فرمائش سے ان کی دینوی زندگی سے بیزاری کی علت معلوم ہوتی ہے، جب آپؑ نے کربلا کی راہ میں فرمایا: سچ مچ دنیا نے اپنا چہرہ بدل دیا ہے اور یہ چہرہ

ناقابل شناخت بن گیا ہے، اس کی بھلائی نابودی سے دوچار ہوئی اور نیکی اور بھلائی میں سے، برتن کی تہ میں بچی رطوبت کے مانند اور مصیبت سے بھری زندگی اور چراگاہ میں بے فائدہ اور بیماری پھیلانے والی گھاس کے مانند کچھ نہیں بچا ہے، کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہو کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا ہے اور باطل کو چھوڑا نہیں جا رہا ہے، ان حالات میں مومن کو حق پہنچتا ہے کہ وہ موت اور خدا کی ملاقات کی آرزو کرے بیشک لوگ دنیا پرست بن گئے ہیں اور دین ان کی زبان کی نوک سے نیچے نہیں اترا ہے [7]

ایک دوسری جگہ پر امام حسینؑ دنیا کی زندگی سے بیزاری کی علت بے احترامی اور مردان الٰہی کی شہادت جانتے ہیں

امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں: جہاں جہاں پر ہم نے پڑاؤ ڈالا اور دوبارہ رخت سفر باندھا، میرے والد گرامی یحییٰ بن ذکریاؑ کی شہادت کا ذکر فرماتے تھے۔

من جملہ ایک دن فرمایا: خدا کے ہاں دنیا کی ذلت کا یہ عالم ہے حضرت یحییٰؑ کے سر اطہر کو تن سے جدا کیا گیا اور تحفہ کے طور پر بنی اسرائیل کی ایک زنا کار عورت کے پاس بھیجا گیا [8]

اس طرح حضرت امام حسین علیہ السلام نے حضرت علی اکبر علیہ السلام کی شہادت کے موقع پر فرمایا کس قدر انہوں نے خداوند متعال اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی اور بے احترامی کی ہے؟ [9]

حواشی

[1] اور ہم نے سلیمان کا امتحان لیا جب ان کی کرسی پر ایک بیجان جسم ڈال دیا تو پھر انہوں نے خدا کی طرف توجہ کی اور کہا پروردگار مجھے معاف فرما اور ایک ایسا ملک عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لئے سزاوار نہ ہو کہ تو بہترین عطا کرنے والا ہے (ص۔3534).

[2] ان دو آیات کی تفسیر اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے ترک اولیٰ اور اس سلسلہ میں ہوئے سوالات کے بارے میں ملاحظہ ہو المیز ان عربی، ج 17، ص 204، تفسیر نمونہ، ج19، ص 282 راہ راہنماشناسی، ص 174، استاد مصباح یزدی.

[3] تفسیر نمونہ، ج19، ص281.

[4] بحارالانوار، ج45، ص43.

[5] وسائل الشیۃ، ج2، ابواب دفن، باب 17، ص922، روایت 8.

[6] بحارالانوار، ج43، ص180174.

[7] تحف العقول، سخنان کوتاہ امام حسینؑ، ص427.

[8] بحارالانوار، ج45، ص299 سافٹ ویر گنجینہ روایات نور ملاحظہ ہو: پرسش ہا و پاسخ ہای دانشجو ی، شمارہ 13، نہاد نمایندگی مقام معظم رہبری در دانشگاہ ہا، مرکز فرھنگی، ادارہ مشاورہ و پاسخ.

[9] بحارالانوار، ج45، ص44.

قرآن مجید کی آخری آیت کونسی ہے؟ کیا وحی میں اضافہ ہونے کا امکان تھا؟

مہربانی کر کے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی آخری آیات کے بارے میں تھوڑی سی وضاحت فرمایئے اور فرمایئے کہ یہ آیات کس زمانے میں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کس عمر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی ہیں؟ اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مثال کے طور پر ستر سال تک پہنچ جاتی تو کیا قرآن مجید کی آیات میں اضافہ ہونے کا امکان تھا؟

مختصر جواب

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی آیات کے بارے میں متعدد اور مختلف روایتیں موجود ہیں ان روایتوں کے بارے میں مجموعی طور پر کہا جا سکتا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو آخری مکمل سورہ نازل ہوا ہے وہ سورہ نصر تھا یہ سورہ، فتح مکہ سے پہلے یا اسی سال نازل ہوا ہے اور آیات کی ابتدا کے لحاظ سے نازل ہونے والا آخری سورہ سورہ برات تھا، یہ سورہ نویں ہجرت کو فتح مکہ کے بعد جنگ تبوک سے واپسی کے دوران پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے لیکن آیات کے لحاظ سے، معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی آیت کے بارے میں ترجیح اس نظریہ کو دی جا سکتی ہے کہ آیہ اکمال دین (مائدہ۔3) آخری آیت ہے چونکہ یہ آیت دین کے مکمل ہونے کا اعلان اور وحی کے اختتام کی طرف اشارہ کرتی

ہے یہ آیت 18 ذی الحجہ سنہ 10 ہجری کو حجہ الوداع سے واپسی پر نازل ہوئی ہے البتہ شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ آیہ اکمال دین احکام سے مربوط آیات کی آخری آیت ہو اور سورہ بقرہ کی آیت نمبر 281 پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی آخری آیت ہو اور یہ آیت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے 21، 9 یا 7 دن قبل نازل ہوئی ہے

لیکن آپ کے سوال کے دوسرے حصہ کے جواب کے بارے میں قابل ذکر بات ہے کہ، ختم نبوت کے بارے میں قطعی دلائل کے پیش نظر اور یہ کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خداوند متعال کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف کے طولانی تر ہونے کی صورت میں قرآن مجید کی آیات میں اضافہ ہونے کا امکان معنی نہیں رکھتا ہے، کیونکہ اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ خداوند متعال نے مکمل اور آخری پیغام کو ناقص چھوڑ دیا ہے اور اسے آخر تک نہیں پہنچایا ہے اور یہ واضح تناقض ہے

تفصیلی جواب

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی آخری آیات کے بارے میں متعدد اور مختلف روایتیں موجود ہیں، اور اسی لئے اس سلسلہ میں مفسرین کے درمیان اختلاف نظر پایا جاتا ہے:

1 بہت سی شیعہ وسنی روایتوں میں آیا ہے کہ: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو آخری چیز نازل ہوئی ہے، وہ سورہ مبارکہ نصر ہے [1]

2 دوسری روایتوں کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی آخری آیات، سورہ مبارکہ برائت کی ابتدائی آیات ہیں، جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سنہ 9 ہجری میں فتح مکہ کے بعد واپسی کے دوران نازل ہوئی ہیں [2]

3 بہت سی روایتوں میں نقل کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی

آخری آیت وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ [3] ہے، کہ جبرئیل امیں نے نزول کے بعد دستور دیا کہ یہ آیت سورہ بقرہ کی آیت نمبر 280 کے بعد قرار دی جائے اور یہ حادثہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے 21 یا 7 دن پہلے واقع ہوا [4]

4 ابن واضح یعقوبی معتقد ہیں کہ صحیح اور صریح روایات کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی آخری آیت، اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ [5] ہے یہ آیت غدیر خم کے دن علی علیہ السلام کو امیر المومنین کی حیثیت سے منصوب کئے جانے کے وقت نازل ہوئی ہے [6]

مرحوم آیت اللہ معرفت فرماتے ہیں: اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ سورہ نصر سورہ برائت (کی ابتدائی آیات) سے پہلے نازل ہوا ہے، چونکہ سورہ نصر فتح مکہ کی بشارت ہے، لہٰذا قبل از فتح مکہ نازل ہوا ہے یا اسی فتح مکہ کے سال، مکہ میں نازل ہوا ہے [7]، جبکہ سورہ برائت فتح مکہ کے ایک سال بعد نازل ہوا ہے پس مذکورہ روایات سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ:

الف: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والا آخری سورہ، سورہ نصر تھا اور سورہ کی ابتدائی آیات نازل ہونے کی حیثیت سے آخری سورہ، سورہ برائت تھا۔

ب: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی آخری آیت کے بارے میں ایسا لگتا ہے کہ ابن واضح یعقوبی کے نظریہ کو ترجیح دی جاسکتی ہے اور آخری نازل ہونے والی آیت آیہ اکمال دین ہے چونکہ اس آیت میں دین کے مکمل ہونے کا اعلان اور وحی کے اختتام تک پہنچنے کا اشارہ ہے۔

لیکن سورہ بقرہ کی آیت نمبر 281 کے بارے میں دو نظریہ پائے جاتے ہیں:

1 یہ آیت حجتہ الوداع میں، عید قربان کے دن، منیٰ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی ہے [8] اگر یہ روایت صحیح ہوتو، آخری آیت اکمال دین ہے کیونکہ آیہ اکمال دین 18 ذی الحجہ کو حجتہ الوداع سے واپسی پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی ہے

2 اگر یہ روایت صحیح ہو، تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی آخری آیت یہی ہونی چاہئے، اور اس صورت میں کہا جاسکتا ہے کہ آیہ اکمالی دین، احکام سے مربوط آیات میں سے آخری آیت ہے، اورسورہ بقرہ کی 281 ویں آیت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی ہونے والی آخری آیت ہے [9]

لیکن آپ کے سوال کے دوسرے حصہ کے جواب میں، کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر طولانی ہونے کی صورت میں کیا مزید آیات نازل ہونے کا امکان تھا یا نہ، اس سلسلہ میں قابل ذکر بات ہے کہ، قطعی اور مسلم دلائل کی بنیاد پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور قرآن مجید، خداوند متعال کا آخری پیغام ہے اس بنیاد پر ہمیں کہنا چاہئے کہ خداوند متعال نے اپنے مکمل اور آخری پیغام کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے توسط سے لوگوں تک پہنچادیا ہے، اب اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف کم تر ہوتی تو یہ پیغام مکمل طور پر اسی مدت کے دوران پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتا اور اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر طولانی تر ہوتی تو یہ پورا پیغام طولانی تر زمانہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتا اس لئے ختم نبوت کی قطعی دلائل کے پیش نظر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر طولانی ہونے کی صورت میں آیات قرآن کے اضافہ ہونے کے امکان کا معنی نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ خداوند متعال نے اپنے مکمل اور آخری پیغام کو ادھورا چھوڑا ہے اور اسے مکمل نہیں کیا ہے، اور یہ واضح تناقض ہے

یہاں پر ہم اس سلسلہ میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے آیت اللہ ہادوی تہران کے ایک بیان کو نقل کرتے ہیں:

قرآن مجید اور تاریخ

کیا قرآن مجید کے حقائق اور معارف اپنے زمانہ سے مربوط ہیں، اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دوسرے زمان و مکان میں پیغمبری پر معبوث ہوتے تو کیا پھر بھی یہی آیات اسی زبان میں ان پر نازل ہوتیں؟ کیا قرآن مجید ایک تاریخی پہلو رکھتا ہے؟

بعضوں نے ان سوالا ت کے جواب میں مطلق رجحان کا نظریہ پیش کیا ہے کہ: قرآن مجید کی آیات وحی کے امور سے متعلق ہیں اور یہ زمان و مکان سے بالاتر ہیں اور ان کا تاریخ اور تاریخ کے امور کے ساتھ کسی قسم کا ربط نہیں ہے ان کی نظر میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس زمان و مکان میں بھی پیغمبری پر مبعوث ہوتے، تو یہی آیات نازل ہوتیں اور قرآن مجید کے مطالب یا زبان میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی

اس نظریہ کے مقابل میں، ایک گروہ نے نسبی رجحانات پر مشتمل نظریہ کے مطابق جواب دیا ہے اور کہا ہے: قرآن مجید کے مطالب ان خاص حالات سے مربوط ہیں کہ جس میں قرآن مجید نازل ہوا ہے، اور اگر زمان و مکان بدل جاتا، نہ صرف زبان بدل جاتی، بلکہ قرآن مجید کے مطالب بھی متفاوت ہوتے یہ لوگ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف طولانی تر ہوتی یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے پہلے پیغمبری پر مبعوث ہوتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی مدت زیادہ ہوتی، تو قرآن مجید کی آیات بھی زیادہ تر ہوتیں اور شائد قرآن مجید کی ضخامت موجودہ ضخامت سے کئی گنا زیادہ ہوتی

اس مسئلہ کی جانچ پڑتال کر کے صحیح جواب حاصل کرنے کے لئے چند نکات کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے:

1 جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، جو چیز انسان کی زندگی میں بدلتی

ہے وہ اس کی زندگی کے چھلکے سے مربوط ہے اور انسان کی اصلی اور جوہری ہویت ان تبدیلیوں سے نہیں بدلتی ہے اس توصیف کے پیش نظر، تاریخی حالات میں فرق، ان مختلف حالات میں موجود انسانوں کے جوہر کو تبدیل نہیں کرتا ہے

2 دین، انسان کی ذاتی اور جوہری ہویت کو مدنظر رکھتا ہے، جو ایک پائدار اور نا قابل تبدیل امر ہے

البتہ دینی حقائق کو حاصل کرنے کے سلسلہ میں مخاطبین کی استعداد میں اضافہ کے تنا سب سے، ادیان نے اپنے تاریخی سفر میں کمال کی طرف قدم بڑھایا ہے اور یہ تکاملی سفر، دین خاتم میں اپنی انتہا تک پہنچتا ہے اور کامل ترین دین ظاہر ہوتا ہے، یہ دین ان تمام چیزوں کا حامل ہے، جو وحی کے ذریعہ بیان ہونی چاہئے اور تحریف سے محفوظ ہے اسی لحاظ سے، کسی دوسرے دین کے ظہور کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے

3 جو پیغمبر، لوگوں کے لئے کسی دین کو لے کر آتا ہے، وہ معارف کے حقائق کو زمانہ کے لوگوں کی زبان میں بیان کرنا چاہئے تا کہ افہام و تفہیم کے امکانات فراہم ہوجائیں اور لوگ اس کے پیغام کو سمجھ سکیں اس لحاظ سے، اگر کوئی پیغمبر ان لوگوں میں مبعوث ہوجائے جو عبرانی زبان میں گفتگو کرتے ہیں، تو اسے عبرانی زبان میں گفتگو کرنی چاہئے تا کہ لوگ اس کی بات کو سمجھ سکیں دوسری جانب سے، پیغمبر کی اپنے پیغام کو وضاحت میں مثالیں بیان کرتے وقت ایسے مفاہیم سے استفادہ کرنا چاہئے جنہیں لوگ سمجھ سکیں پس جس زمانہ میں کوئی پیغمبر مبعوث ہوا ہے اس کی تاریخی حقیقت پیغمبر کی زبان اور اس کے پیغام کے محتویٰ پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس طرح پائدار عناصر کے ضمن میں دین میں کچھ وقتی عناصر بھی ظاہر ہوتے ہیں

ان اوصاف کے پیش نظر اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انگریزی بولنے والی کسی سرزمین میں مبعوث ہوتے، تو بیشک قرآن مجید انگریزی زبان میں نازل ہوتا اور اگر اس سرزمین میں

لوگ اونٹ کے بجائے پنگوئن سے سروکار رکھتے تو اونٹ کی حیرت انگیز خلقت کے بجائے پنگوئن کی حیرت انگیز خلقت کی طرف اشارہ کیا جاتا

لیکن یہ امر اس چیز کا سبب نہیں بن سکتا ہے کہ قرآن مجید اپنے مطالب کے تقدس اور قدر و منزلت کو کھودے کیونکہ اولاً: اگر یہ تبدیلیاں رونما ہوتیں، تو صرف اس کے وقتی عناصر سے مربوط ہوتیں جو انسانی زندگی کا چھلکا ہے، اور پائیدار عناصر، جو انسان کی ہویت پر ناظر ہیں، اثر انداز نہیں ہوتیں دوسرے الفاظ میں، دین خاتم کا لافانی پیغام ہر زمان و مکان میں یکساں ہے، اگر چہ ممکن ہے کسی دوسرے زمان و مکان میں ظاہر ہو جائے، زبان، قالب اور اس کا محتوی اس کے وقتی اور ظاہری تبدیل ہونے والے حصہ پر اثر انداز ہوسکتا ہے

ثانیاً: ایک پیغمبر کے زمان و مکان کا انتخاب خداوندمتعال کی حکمت کے مطابق انجام پاتا ہے اور یہ ایک اتفاقی امر نہیں ہے یہ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جزیرۃ العرب میں تاریخ کے اس خاص زمانہ میں مبعوث ہوئے ہیں، حکمت و دلیل کے بغیر کوئی حادثہ نہیں ہے یہ جو اس طرح کے ماحول کا اقتضا تھا، کہ قرآن مجید عربی زبان میں ہونا چاہئے، اس بات کی علامت ہے کہ خدا کی حکمت کے مطابق یہ زبان، دین خاتم کے مطالب کو بیان کرنے کے لئے مناسب ترین زبان تھی، اور یہ کہ اسلام عربوں کی جہالت کے ماحول میں ظہور پیدا کرے، اس حقیقت کو بیان کرتا ہے، کہ اسلام کے لافانی مفاہیم کو بیان کرنے کے لئے بہترین حالات اسی فضا میں موجود تھے پس اگر قرآن مجید میں اونٹ کی مثال پیش کی جاتی ہے، اس کی وجہ مخاطبین کی اس حیوان سے آشنائی ہے لیکن معرفت کی اس قسم کے مطابق قرآن مجید کے حقائق بیان کرنے کے لئے ان مخاطبین کو منتخب کرنا، اس بات کی علامت ہے کہ اس مطلب کے لئے بہترین مثال وہی اونٹ کی مثال تھی

اس لحاظ سے حکمت الٰہی میں آیات کی یہی تعداد اور اسی عربی زبان میں اور انہی

مثالوں کے ساتھ دین خاتم کے پیغام کو پہنچانے کے لئے بہترین طریقہ تھا اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ: اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی مدت طولانی تر ہوتی تو قرآن مجید کی آیات کی تعداد اوراس کے محتویٰ میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوتی

حواشی

[1] طبرسی، مجمع البیان، ج 10، ص 554: بحرانی، تفسیر برھان، ج 1، ص 29 سیوطی، الاتقان، ج، ص 27.

[2] فیض کاشانی، تفسیر صافی، ج 1، ص 680.

[3] بقرہ، 281.

[4] تفسیر شبر، ص 83.

[5] مائدہ، 3.

[6] تاریخ یعقوبی، ج 2، ص 35.

[7] اسباب النزول، بھامش الجلالین، ج 2، ص 145.

[8] زرکشی، برھان، ج 1، ص 187.

[9] آیت اللہ محمد ہادی معرفت، تلخیص التمہید، ج 1، ص 80 و 81.

قیامت کے بعد جب لوگ جنت یا جہنم میں جائیں گے تو کیا دوبارہ موت ہوگی؟

مختصر جواب

قرآنی آیات، روایات اور عقلی دلائل اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں، کہ جب انسان جنت یا جہنم میں چلے جائیں گے تو پھر دوبارہ موت نہیں ہوگی۔ قرآن مجید ایک طرف قیامت کا **یوم الخلود** (جاوداں دن) نام رکھتا ہے، اور دوسری جانب بہشتیوں کو **خالدین** (ہمیشہ رہنے والے) کی صفت سے متصف کرتا ہے۔ روایات میں بھی ہے کہ جھنمیوں اور بہشتیوں سے خطاب ہوگا کہ: تم ہمیشہ یہاں رہنے والے ہو۔ پس پھر کوئی موت نہیں ہوگی۔ **(یا اھل الجنۃ خلود فلا موت و یا اھل النار خلود فلا موت)** اور موت کو ان کے سامنے ایک بھیڑ کی شکل میں لائیں گے اور ذبح کریں گے۔ لیکن عقلی نقطہ نظر سے چونکہ انسان کا نفس مادہ سے مجرد ہے اور ہر مجرد فنا ناشدنی ہے پس انسانوں کو جنت یا جہنم میں جانے کے بعد موت نہیں ہوگی۔

تفصیلی جواب

قیامت کبریٰ، جو عالم برزخ کے بعد ایک ایسا عالم ہے جہاں پر سب انسان جمع ہوں گے اور زندگی کے ایک نئے مرحلے میں وارد ہوں گے وہ اپنے دنیاوی زندگی کے اعمال

اور کردار کی جزا پائیں گے۔[1]

قرآنی آیات، روایات اور عقلی دلیلیں اس پر اتفاق رکھتی ہیں کہ قیامت کبریٰ کے بعد (یعنی انسانوں کے جنت یا جہنم میں جانے کے بعد) دوبارہ موت نہیں ہوگی۔

ہم یہاں پر ان میں سے بعض دلیلوں کی جانب اشارہ کریں گے۔

قرآن مجید قیامت کو ستّر (۷۰) ناموں سے پکارتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کو اپنی خصوصیت سے یاد کرتا ہے مثال کے طور پر اس لحاظ سے کہ اس دن سب موجودات انسان اور حیوان محشور ہو جائیں گے، اس کو یوم حشر کا نام دیتا ہے۔ اور اس لحاظ سے کہ وہ ہمیشگی ہے اور اس میں موت واقع نہیں ہوگی اسے یوم الخلود کہا گیا ہے[2] یہ نام سورہ مبارکہ ق میں ذکر ہوا ہے۔[3]

اس کے علاوہ قرآن مجید، ستّر (۷۰) بار سے زیادہ، اہل بہشت اور دوزخ کا خلود اور جاوداں کی صفت سے نام لیتا ہے۔ ہم یہاں نمونے کے طور پر قرآن کی دو آیات کی طرف اشارہ کریں گے۔

ہاں، سچ تو یہ ہے کہ جس نے برائی حاصل کی اور اس کے گناہوں نے چاروں طرف سے اسے گھیر لیا ہے وہی لوگ تو دوزخی ہیں اور وہی تو اس میں ہمیشہ رہیں گے [4]

اور جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اچھے کام کئے ہیں وہی لوگ جنتی ہیں کہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے [5]

روایات میں بیان ہوا ہے کہ قیامت میں موت موجود نہیں ہے، من جملہ ان روایات کے علامہ مجلسی (رح) نے بحار الانوار کی آٹھویں جلد کے باب نمبر ۲۶ میں مختلف احادیث نقل کی ہیں جو یہ بیان کرتی ہیں کہ موت کو ایک بھیڑ کی صورت میں اہل جنت اور جہنم کے سامنے ذبح کیا جائے گا۔

ان ہی روایات میں سے ایک روایت حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب خداوند متعال جنّتی لوگوں کو جنت میں اور جہنمی لوگوں کو جہنم میں لے جائے گا تو موت کو ایک بھیڑ کی صورت میں لایا جائے گا اور ان کی آنکھوں کے سامنے اسے ذبح کیا جائے گا، اس کے بعد منادی آواز دے گا یا اہل الجنۃ خلود فلا موت یا اہل النار خلود فلا موت [6] یعنی قیامت کے بعد پھر موت نہیں ہوگی بلکہ خلود اور جاودانگی ہو گی۔[7]

عقلی نقطہ نظر سے چونکہ انسانی نفس مجرد ہے۔ اور ہر مجرد فنا نا شدنی ہے پس انسان کے بہشت اور جہنم میں جانے کے بعد دوبارہ اُسے موت نہیں ہوگی۔

نفس کے تجرد پر حکماء اور متکلمین کے بعض دلائل:

۱۔ نفس کلیات کا ادراک کرتا ہے، کلی مجرد ہے، پس اس کا محل بھی مجرد ہونا چاہئے۔

۲۔ نفس کو ایسے امور پر قدرت حاصل ہے جن پر جسم کو قدرت حاصل نہیں ہے، جیسے غیر متناہی کا تصور کرنا۔

۳۔ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ حواس کے سب مدرِکات کو ایک چیز ادراک کرتی ہے۔ جو نفس کے تجرد کی دلیل ہے۔ کیونکہ حواس ایک دوسرے کے ادراکات سے باخبر ہیں۔ مثال کے طور پر، آنکھ، چینی کی سفیدی کو دیکھتی ہے لیکن اس کے مزے سے باخبر نہیں ہے یا کسی چیز کو اگر دیکھے بغیر منہ میں رکھیں گے تو اس کے مزے کا احساس کریں گے۔ لیکن اس کے رنگ کو نہیں جانتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ہمارے اندر ایک مجرد کلی چیز موجود ہے جو ان سب ادراکات کو سمجھ لیتی ہے۔

۴۔ جسمانی قوتیں کام کرنے کی وجہ سے فرسودہ ہوتی ہیں۔ لیکن نفس کی قوت اس

کے برخلاف ہے، کیونکہ تعقلات کی کثرت اسے طاقتور بنا دیتی ہے پس نفس جسم کی قسم میں سے نہیں ہے بلکہ مجرد ہے۔[8]

۵۔نفس کے مجرد ہونے کی پانچویں دلیل یہ ہے کہ نفس کی وحدت شخصی ہے، بدن تبدیل ہوتا ہے (یعنی اس کے خلیّے ختم ہوکر نئے ہوتے ہیں) لیکن ان سب تغیرات میں ایک ثابت امر موجود ہے جس کا نام نفس ہے۔ اور یہ نفس مادہ کی تغییرات سے متغیر نہیں ہوتا۔ پس وہ مادہ سے مجرد ہے۔[9]

البتہ بعض لوگ اس نظریے کے مخالف ہیں اور وہ روح کو مادی جانتے ہیں اور مغز کو اس سے ایک ہی جانتے ہیں، لیکن ان کی دلیلیں مغز کے خلیوں کے آپسی رابطے کو ثابت کرتی ہیں، نہ کہ مغز کلی ادراک کو انجام دے سکتا ہے۔

پس روح کی بقاء کے مسئلہ کا روح کے تجرد اور استقلال کے ساتھ ایک نزدیکی رابطہ ہے، کیونکہ اگر مجرد ہوگا تو وہ موت کے بعد باقی رہ سکتا ہے،

ہاں، مجردات کا فنا ناپذیر ہونا فلسفیانہ مباحث میں سے ہے،جس کے بارے میں اطلاع حاصل کرنے کے لئے ہمیں فلسفہ کی کتابوں کی جانب رجوع کرنا ہوگا۔

حواشی

[1] برزخ کا عالم شخصی ہے، اور ہر آدمی مرنے کے بعد برزخ میں جاتا ہے، اور قیامت کبریٰ جمع سے متعلق ہے، یعنی جب عالم کے سب افراد ایک مرتبہ محشور ہوجائیں گے،، رجوع کریں۔ جہاں بینی، شہید مطہری، بحث معاد، ص ۳۱۔

[2] مکارم شیرازی، پیام قرآن، بحث معاد، ج ۵، ص ۵۸۔

[3] ادخلوہا بسلام ذلک یوم الخلود، سورہ ق۔ ۳۴۔

[4] سورہ بقرہ۔۸۱۔

[5] سورہ بقرہ۔ ۸۲۔

[6] و روی مسلم فی الصحیح بالاسنادعن ابی سعید الخذری، قال: قال رسول اللهﷺ اذا دخل الجنة الجنة و اھل النا النار قیل یا اھل الجنة فیشرفون و ینظرون و قیل یا اھل النار فیشوفون و ینظرون فیجاء بالموت کانه کبش املح فیقال لھم تعرفون الموت فیقولون ھو ھذا و کل قد عرفه قال فیقدم و یذبح ثم یقال یا اھل الجنة خلود فلاموت و یا اھل النار خلود فلا موت قال و ذلك قوله و انذرھم یوم الحسرة الایة،
بحار الانوا، ج ۸ س ۳۴۴، اور ۳۴۵۔

[7] البتہ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جب جہنم میں جائیں گے تو ہمیشہ وہاں پر رہیں گے، بلکہ جہنم میں ہمیشہ رہنا بعض کے لئے مخصوص ہے۔

[8] علامہ شعرانی، ترجمہ شرح الاعتقاد، ص ۳۴۲۔ تا ۳۶۲۔

[9] آیۃ اللہ مکارم شیرازی، پیام قرآن، بحث معادج ۵۔ ص ۳۷۸۔